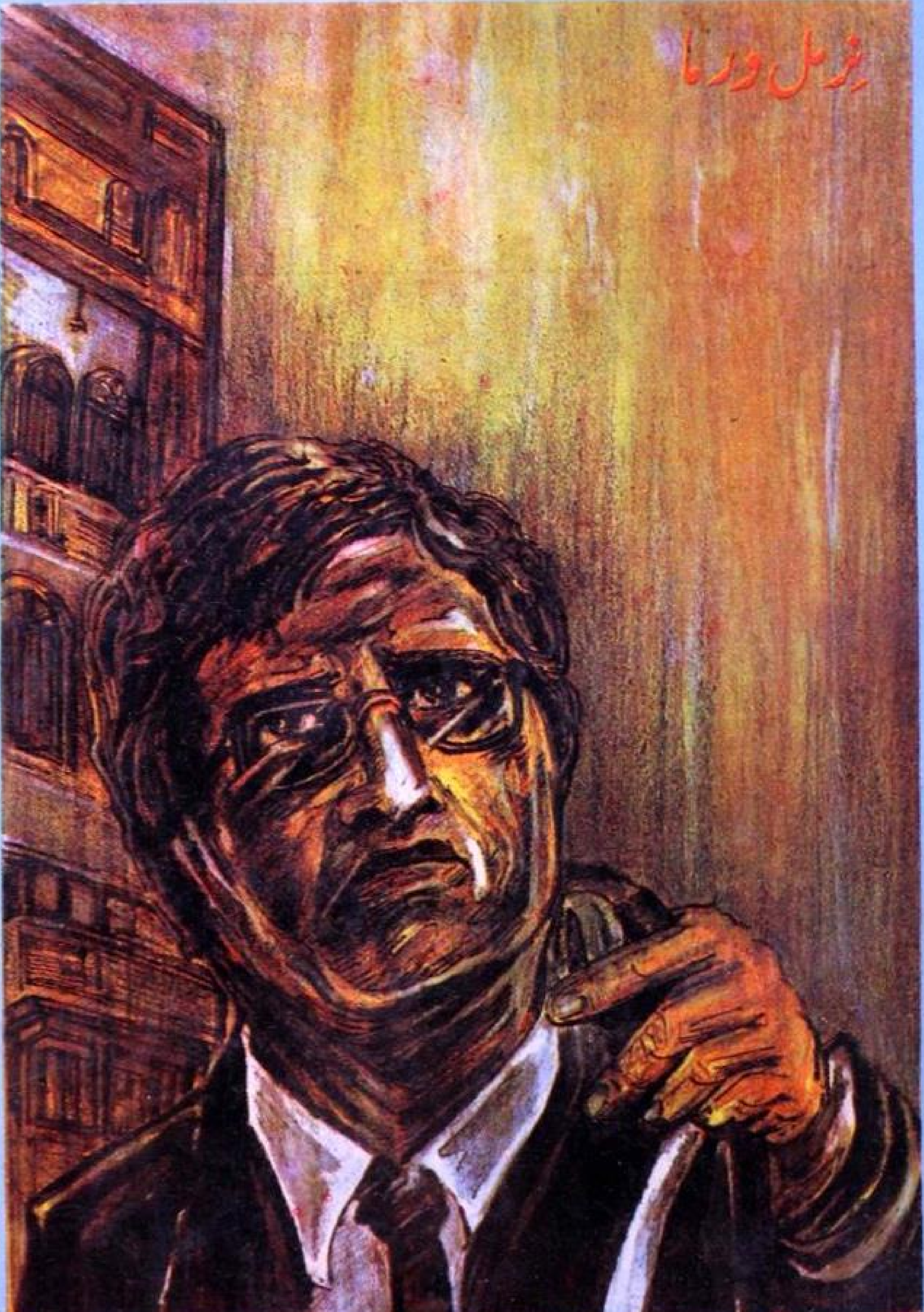

ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے نوازا گیا ہندی کا مجموعہ داستان

کوّے اور کالا پانی

کوّے اور کالا پانی

ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے نوازا گیا ہندی کا مجموعۂ داستان

کوّے اور کالا پانی

مصنّف

نرمل ورما

مترجم

انیس اشفاق

ساہتیہ اکادمی

Kavve Aur Kala Pani : Urdu translation by Anis Ashfaq of Akademi's award-winning Hindi short stories by Nirmal Verma, Sahitya Akademi, New Delhi (1997), Rs. 80

© ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۷ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس

رویندر بھون، ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس

سواتی مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر

جیون تارا بلڈنگ۔ چوتھی منزل، ۲۳ اے/۴۴ ایکس۔ ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳
۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴
گنا بلڈنگ، دوسری منزل، ۳۰۴-۳۰۵، انا سلائی، تینام پیٹھ۔ مدراس ۶۰۰۰۱۸
اے۔ ڈی۔ اے رنگ مندر ۱۰۹ جے۔ سی۔ روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

80
قیمت : اسّی روپے

ISBN : 81-260-0266-2

طباعت : ناگری پرنٹرس، نوین شاہدرہ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

ترتیب

دھوپ کا ایک ٹکڑا ۷
دوسری دنیا ۱۵
زندگی یہاں اور وہاں ۴۲
صبح کی سیر ۶۹
آدمی اور لڑکی ۸۶
کوّے اور کالا پانی ۱۰۹
ایک دن کا مہمان ۱۵۶

کہانیوں کی ترتیب زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے ہے۔

”دھوپ کا ایک ٹکڑا“ اسٹیج کی گئی تھی اس لیے وہ دو اور کہانیوں کے ساتھ ”تین ایکانت“ میں شامل کی گئی تھی۔ اسی طرح ”دوسری دنیا“ چند دوسرے مجموعوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن مصنّف کے افسانوی مجموعے میں یہ دونوں کہانیاں پہلی بار شائع کی جا رہی ہیں۔

دھوپ کا ایک ٹکڑا

کیا میں اس بنچ پر بیٹھ سکتی ہوں؟ نہیں آپ اُٹھیے نہیں میرے لیے یہ کونا ہی بہت ہے۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ میں دوسری بنچ پر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؛ اتنا بڑا پارک ہے چاروں طرف خالی بنچیں ہیں پھر میں آپ ہی کے پاس کیوں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ جس بنچ پر آپ بیٹھی ہیں وہ میری ہے۔ جی ہاں، میں یہاں روز بیٹھتی ہوں۔ نہیں آپ غلط نہ سمجھیں۔ اس بنچ پر میرا نام نہیں لکھا ہے۔ بھلا میونسپلٹی کی بنچوں پر نام کیوں؟ لوگ آتے ہیں گھڑی دو گھڑی بیٹھتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ فلاں دن فلاں آدمی یہاں بیٹھا تھا۔ اس کے اُٹھ جانے کے بعد بنچ پہلے کی ہی طرح خالی ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد جب کوئی نیا آنے والا اس پر آکر بیٹھتا ہے تو اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس سے پہلے یہاں کوئی اسکولی لڑکی، کوئی تنہا بوڑھی عورت یا نشے میں دھت کوئی جپسی بیٹھا ہوگا۔ نہیں صاحب نام تو وہیں لکھے جاتے ہیں جہاں آدمی مستقل طور پر رہتا ہے۔ تبھی تو گھروں کے نام ہوتے ہیں اور قبروں کے بھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ قبروں پر نام نہ بھی ہوں تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کوئی زندہ شخص جان بوجھ کر دوسرے کی قبر میں جانا پسند نہیں کرے گا۔

آپ اُدھر دیکھ رہے ہیں — گھوڑا گاڑی کی طرف؟ نہیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ اب بھی گھوڑا گاڑی کا استعمال کرتے ہیں... میں تو روز ہی دیکھتی ہوں۔ اسی لیے میں نے یہ بنچ اپنے لیے منتخب کی ہے۔ یہاں بیٹھ کر آنکھیں سیدھی گرجا گھر کی طرف اُٹھتی ہیں۔ آپ کو اپنی گردن ٹیڑھی نہیں کرنا پڑتی۔ بہت پرانا گرجا گھر

ہے۔ اس گرجا گھر میں شادی کا ہونا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے لوگ شادی سے آٹھ دس ماہ قبل ہی یہاں اپنا نام درج کرا لیتے ہیں حالانکہ منگنی اور شادی کے درمیان اتنا طویل وقفہ ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی اس وقفے کے دوران جب دونوں میں ناچاقی ہو جاتی ہے اور عین شادی کے موقع پر دولہا۔ دلہن میں سے کوئی نہیں دکھائی دیتا تو یہ جگہ سنسان پڑی رہتی ہے۔ نہ کوئی بھیڑ نہ گھوڑا گاڑی۔ بھکاری بھی خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں۔ ایسے ہی دنوں میں، ایک روز میں نے سامنے والی بنچ پر ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی اور ویران آنکھوں سے گرجا گھر کو دیکھ رہی تھی۔

پارک میں یہی ایک مشکل ہے۔ اتنی کھلی جگہ میں بھی سب اپنے اندر بند بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ کسی کے پاس بیٹھ کر دلجوئی کے دو حرف بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ دوسروں کو دیکھتے ہیں اور دوسرے آپ کو۔ اس میں بھی کچھ سکون ملتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اکیلے کمرے کی اذیت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو لوگ باہر سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ کسی عوامی پارک یا پب میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں کوئی دلجوئی کرنے والا نہ بھی ہو تب بھی کچھ دیر کے لیے دل بہل جاتا ہے۔ اس سے تکلیف کا بوجھ تو کم نہیں ہوتا، پھر بھی آپ قلی کے سامان کی طرح اسے ایک کندھے سے اُتار کر دوسرے کندھے پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ راحت کیا کم ہے؟ میں تو یہی کرتی ہوں —— صبح ہوتے ہی اپنے کمرے سے باہر نکل آتی ہوں۔ نہیں نہیں، آپ غلط نہ سمجھیں۔ مجھے تکلیف کوئی نہیں میں یہاں دھوپ کے لیے آتی ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سارے پارک میں صرف یہی ایک ایسی بنچ ہے جو کسی پیڑ کے نیچے نہیں ہے۔ اس بنچ پر ایک پتّہ بھی نہیں گرتا —— پھر یہاں بیٹھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہاں سے میں سیدھے گرجا گھر کی طرف دیکھ سکتی ہوں۔ لیکن یہ بات شاید میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں

آپ واقعی خوش نصیب ہیں۔ پہلے دن یہاں آئے اور گھوڑا گاڑی آپ کی نظر کے سامنے! آپ دیکھتے جائیے —— کچھ ہی دیر میں گرجا گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ ان میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نہ دولہا کو جانتے ہیں نہ دلہن کو لیکن انھیں ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں باہر کھڑے رہتے ہیں۔ آپ کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں لیکن کچھ چیزوں

کو دیکھنے کی بے چینی زندگی بھر ختم نہیں ہوتی۔ اب دیکھیے نا۔ ابھی آپ اس پیرمبلیٹر کے سامنے بیٹھے تھے فوراً آپ کا جی چاہا ہوگا کہ آپ اندر جھانک کر دیکھیں۔ اس توقع میں کہ آپ کا بچہ دوسرے بچوں سے بالکل الگ ہوگا۔ نہیں، اس عمر میں سارے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ منہ میں چُسنی دبائے لیٹے رہتے ہیں۔ پھر بھی جب میں کسی پیرمبلیٹر کے سامنے سے گزرتی ہوں، تو ایک بار اندر جھانکنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مجھے یہ سوچ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہمیشہ ایک سی ہوتی ہیں اُن سے اُکتانے کے بجائے آدمی انھیں کو سب سے زیادہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسے پالنے میں لیٹے ہوئے بچے یا نَو بیاہتا جوڑے کی گھگھی یا جنازے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسی چیزوں کے گِرد ہمیشہ بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ آپ چاہیں نہ چاہیں پاؤں ان کی طرف خود بخود اُٹھ جاتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جن چیزوں کی وجہ سے ہم زندگی کو انگیز کرتے ہیں وہی چیزیں ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا آپ اپنی پیدائش کے وقت کو یاد کر سکتے ہیں یا اپنی موت کے بارے میں کسی کو کچھ بتا سکتے ہیں۔ یا آپ کو اپنی شادی کا تجربہ دوبارہ ٹھیک اسی طرح ہو سکتا ہے؟ آپ ہنس رہے ہیں... نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ بھلا کون ایسا شخص ہے جو اپنی شادی کے تجربے کو یاد نہیں کر سکتا۔ میں نے سنا ہے کہ بعض ایسے ملک ہیں جہاں لوگ اس وقت تک شادی کا فیصلہ نہیں کرتے جب تک نشے میں دُھت نہ ہو جائیں... بعد میں انھیں اس فیصلے کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہتا۔ میرا مطلب، اس قسم کے تجربے سے نہیں تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کیا آپ اُس لمحے کو یاد کر سکتے ہیں جب آپ اچانک یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تنہا نہ رہ کر دوسرے کے ساتھ رہیں گے... ساری عمر۔ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ ٹھیک اس نقطے پر انگلی رکھ سکتے ہیں جہاں آپ اپنے اندر کی تنہائی کو تھوڑا سا ہٹا کر کسی دوسرے کو وہاں آنے دیتے ہیں... جی ہاں... اسی طرح جس طرح کچھ دیر پہلے آپ نے ذرا سا سرک کر مجھے بنچ پر بیٹھ جانے دیا تھا اور اب میں آپ سے یوں باتیں کر رہی ہوں گویا آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔

لیجیے اب دو چار سپاہی بھی گرجا گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اگر بھیڑ اسی طرح بڑھتی رہی تو آنے جانے کا راستہ بھی رک جائے گا۔ آج تو خیر دھوپ نکلی ہے، لیکن ابر آلود موسم میں

بھی لوگ ٹھٹرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ میں تو برسوں سے دیکھتی آ رہی ہوں... کبھی کبھی تو یہ وہم ہوتا ہے کہ پندرہ سال قبل میری شادی کے موقع پر جو لوگ جمع ہوئے تھے، وہی لوگ آج بھی جمع ہیں۔ وہی گھوڑا گاڑی، وہی اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے سپاہی... جیسے اس دوران کچھ بھی نہ بدلا ہو۔ جی ہاں، میری شادی بھی اسی گرجا گھر میں ہوئی تھی۔ لیکن یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ گھوڑا گاڑی سیدھی گرجا گھر کے دروازے پر آکر لگ سکے۔ ہمیں اسے گلی کی پشت پر ہی روک دینا پڑتا تھا... میں اپنے باپ کے ساتھ پیدل چل کر یہاں آئی تھی... سڑک کے دونوں طرف لوگ کھڑے تھے اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ کہیں سب کے سامنے میرا پاؤں نہ پھسل جائے۔ پتہ نہیں وہ لوگ اب کہاں ہوں گے جو اس روز بھیڑ میں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آپ کیا سوچتے ہیں... اگر ان میں سے آج کوئی مجھے دیکھے تو کیا پہچان لے گا کہ بنچ پر بیٹھی تنہا عورت وہی لڑکی ہے جو پندرہ سال پہلے سفید پوشاک میں ملبوس گرجا گھر کی طرف جا رہی تھی۔ سچ بتائیے پہچان لے گا؟ انسانوں کی بات تو میں نہیں جانتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ گھوڑا مجھے ضرور پہچان لے گا جو اس دن اپنی گاڑی میں کھینچ کر مجھے یہاں لایا تھا۔ جی ہاں، گھوڑوں کو دیکھ کر میں ہمیشہ حیران رہ جاتی ہوں۔ کبھی آپ نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے؟ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی زبردست روحانی شے سے الگ کر دیئے گئے ہیں اور ابھی تک اس جدائی کے عادی نہیں ہو سکے ہیں۔ اس لیے وہ انسانوں کی دنیا میں سب سے زیادہ اداس رہتے ہیں۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی کسی چیز کا عادی نہ ہو سکے۔ وہ لوگ جو کسی چیز کے عادی نہیں ہو پاتے گھوڑوں کی طرح لاتعلق ہو جاتے ہیں یا میری طرح دھوپ کے ایک ٹکڑے کی تلاش میں ایک بنچ سے دوسری بنچ کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔

کیا کہا آپ نے؟ نہیں آپ نے شاید مجھے غلط سمجھ لیا، میرے اولاد کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی میری خوش نصیبی ہے۔ اولاد ہوتی تو شاید میں کبھی الگ نہ ہو پاتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شوہر اور بیوی میں پیار نہ بھی ہو تب بھی اولاد کی خاطر وہ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسی بندش کبھی نہیں رہی۔ اگر سُکھ کا مطلب یہ ہے کہ ہم تنہائی پسند ہو جائیں تو اس

لحاظ سے میں بہت مطمئن ہوں لیکن تنہائی کو پسند کرنا الگ بات ہے اور اس کا عادی ہونا بالکل دوسری بات۔ جب شام کو دھوپ ڈھلنے لگتی ہے تو میں اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں لیکن کمرے میں جانے سے قبل کچھ دیر اس پب میں ضرور بیٹھتی ہوں جہاں وہ میرا انتظار کرتا تھا۔ اس پب کا نام آپ جانتے ہیں؟ بونا پارٹ — جی ہاں۔ کہتے ہیں جب نپولین پہلی بار اس شہر میں آیا تھا تو اسی پب میں بیٹھا تھا۔ لیکن اُن دنوں مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ جب پہلی بار اس نے کہا کہ ہم بونا پارٹ کے سامنے ملیں گے تو ملاقات کی شام سارے وقت میں شہر کے اس سرے پر کھڑی رہی جہاں نپولین گھوڑے پر بیٹھا ہے۔ کیا اپنے محبوب سے ملاقات کا پہلا دن آپ نے کبھی اس طرح گزارا ہے کہ آپ پوری شام پب کے سامنے کھڑے رہیں اور آپ کی منگیتر شارعِ عام پر بنے مجسمے کے نیچے کھڑی رہے۔ بعد میں جو اس کا شوق تھا وہ میری عادت بن گیا۔ ہم دونوں ہر شام کبھی اُس جگہ پر جاتے جہاں وہ مجھ سے ملنے سے پہلے بیٹھا کرتا تھا اور کبھی شہر کے اُن علاقوں میں گھومنے نکل جاتے جہاں میں نے بچپن گزارا تھا۔ کیا آپ کو یہ بات انوکھی نہیں معلوم ہوتی کہ جب ہم کسی شخص کو بہت چاہنے لگتے ہیں تو نہ صرف حال میں اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں بلکہ اس کے اُس ماضی کو بھی اپنا لینا چاہتے ہیں جس میں وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ہم اتنے حساس اور خود غرض ہو جاتے ہیں کہ اس وقت کا تصوّر بھی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے جب وہ ہمارے بغیر جیتا تھا، پیار کرتا تھا اور سوتا جاگتا تھا۔ پھر اگر کچھ سال آپ اسی شخص کے ساتھ گزار دیں تو یہ بتانا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی عادت آپ کی اپنی ہے اور کون سی آپ نے دوسرے سے اختیار کی ہے... جی ہاں، تاش کے پتّوں کی طرح یہ عادتیں آپ میں اس طرح گھل مل جاتی ہیں کہ آپ کسی ایک پتّے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ پتّہ میرا ہے اور وہ پتّہ اس کا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ مرنے سے قبل ہم میں سے ہر ایک کو اس بات کی اجازت ملنا چاہیے کہ ہم اپنی کاٹ چھانٹ خود کر سکیں، اپنے ماضی کی تہوں کو پیاز کے چھلکوں کی طرح اُتارنا شروع کر دیں... آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اس وقت سب لوگ اپنا اپنا حصّہ لینے آپہنچیں گے۔ ماں، باپ، دوست، شوہر... سارے چھلکے دوسرے لے جائیں گے۔ آپ کے ہاتھ میں صرف سوکھا ڈنٹھل رہ جائے گا جو کسی کام کا نہیں۔ جیسے مرنے کے بعد جلا دیا جاتا ہے یا مٹّی کے

نیچے دبا دیا جاتا ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص اکیلا مرتا ہے۔ میں یہ نہیں مانتی۔ وہ اُن سب لوگوں کے ساتھ مرتا ہے جو اس کے اندر تھے۔ جن سے وہ جھگڑتا تھا، محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے اندر پوری ایک دنیا لے کر جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں دوسروں کے مرنے پر جو دُکھ ہوتا ہے اس میں ہماری خود غرضی شامل ہوتی ہے کیونکہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہمارا بھی ایک حصّہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔

دیکھیے! — وہ جاگ گیا۔ ذرا پیرمبلیٹر ہلائیے۔ دھیرے دھیرے ہلاتے رہیے۔ اپنے آپ چُپ ہو جائے گا۔ مُنہ میں چُسنی دبائے اس طرح لیٹا ہے جیسے کوئی چھوٹا سا سگار ہو۔ دیکھیے بادلوں کی طرف کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تو بادلوں کو دیکھ کر لکڑی اس طرح گھماتی تھی جیسے وہ میرے ہی اشاروں پر چل رہے ہوں... آپ کیا سوچتے ہیں؟ بچّے اس عمر میں جو کچھ دیکھتے سنتے ہیں کیا بعد میں وہ انھیں یاد رہتا ہے... رہتا ضرور ہوگا... کوئی آواز کوئی جھلک یا کوئی آہٹ جو عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کی بھول بھلیّوں میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن کسی انجان لمحے میں اچانک ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس آواز کو ہم نے کہیں سنا ہے یا اس طرح کا واقعہ پہلے بھی رونما ہوا ہے... اور پھر اسی کے ساتھ بہت سی ایسی چیزیں بھی سامنے آنے لگتی ہیں جو ہمارے اندر بہت پہلے سے ہوتی ہیں لیکن روزمرّہ کی دوڑ دھوپ میں ہمیں ان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن وہ ہمارے اندر موقع کی تلاش میں گھات لگائے کسی کونے میں بیٹھی رہتی ہیں پھر سڑک پر چلتے ہوئے، ٹرام کا انتظار کرتے وقت یا رات کے وقت سونے اور جاگنے کے درمیان اچانک ہمیں پکڑ لیتی ہیں۔ اس وقت ہم کتنا ہی ہاتھ پاؤں ماریں، کتنا ہی چھٹپٹائیں وہ ہمیں چھوڑتیں نہیں۔ میرے ساتھ ایک رات ایسا ہی ہوا تھا...

ہم دونوں سو رہے تھے کہ مجھے عجیب سا کھٹکا سنائی دیا — بالکل اس طرح جس طرح بچپن میں مَیں سوتے میں چونک اُٹھتی تھی اور مجھے یہ وہم ہوتا تھا کہ دوسرے کمرے میں ماں اور بابو نہیں ہیں — مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اب میں انھیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی اور تب میں چیخنے لگتی تھی۔ لیکن اس رات میں چیخی نہیں۔ بستر سے اُٹھ کر دیوڑھی تک آئی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا باہر کوئی نہ تھا۔ واپس آ کر اسے دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے اسی طرح سو رہا تھا جیسے وہ ہر رات سوتا تھا۔ اُس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ کھٹکا باہر نہیں میرے اندر ہی ہوا

تھا۔ نہیں، میرے اندر بھی نہیں۔ اندھیرے میں ایک چمگادڑ کی طرح وہ مجھے چھوتا ہوا گزر گیا تھا... نہ باہر نہ اندر... پھر بھی چاروں طرف پھڑپھڑاتا ہوا۔ میں پلنگ پر اس جگہ آکر بیٹھ گئی جہاں وہ لیٹا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے اس کے جسم کو چھونے لگی۔ جسم کے ان سارے حصّوں کو جو ایک زمانے میں مجھے سکون دیتے تھے۔ مجھے عجیب سا لگا کہ میں اسے چھو رہی ہوں اور میرے ہاتھ خالی لوٹ رہے ہیں۔ برسوں پہلے کی وہ گونج جو اس کے اعضا سے نکل کر میری روح میں گردش کرنے لگتی تھی اب کہیں نہیں تھی۔ میں اس کی چھاتی کو اسی طرح ٹٹول رہی تھی جس طرح کچھ لوگ پرانے کھنڈروں کی دیواروں پر برسوں پہلے کے لکھے ہوئے اپنے ناموں کو تلاش کرتے ہیں لیکن میرا نام وہاں کہیں نہیں تھا۔ کچھ نشان تھے جنھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جن کا مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور میرے مردہ ہاتھ اس کی چھاتی پر پڑے رہے... کتنی بھیانک بات تھی کہ میں اس خالی پن کو کسی سے بتا نہیں سکتی تھی جو ہم دونوں کے بیچ پیدا ہو گیا تھا۔ جی ہاں، اپنے وکیل سے بھی نہیں جنھیں میں عرصے سے جانتی تھی۔

وہ سمجھے میں سٹھیا گئی ہوں۔ کیسا کھٹکا؟ کیا میرا شوہر کسی دوسری عورت کے ساتھ جاتا تھا؟ کیا وہ میرے تئیں بے رحم تھا؟ جی ہاں... اس نے سوالوں کی بوچھار کر دی اور میں تھی کہ ایک گاودی کی طرح اس کا منہ تکتی رہی۔ اس وقت مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ الگ ہونے کے لیے عدالت یا کچہری جانا ضروری نہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ اپنا دُکھ بانٹ کر ہم ہلکے ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہیں، لوگ دُکھ نہیں بانٹتے، صرف فیصلہ کرتے ہیں کہ کون قصوروار ہے اور کون بے قصور۔ مشکل یہ ہے کہ جو شخص آپ کی دُکھتی رگ کو ٹھیک ٹھیک پکڑ سکتا ہے اسی سے ہم الگ ہو جاتے ہیں... اسی لیے میں اپنے محلے کو چھوڑ کر اس علاقے میں آگئی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یہاں دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ یہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ آٹھ سال رہ کر الگ ہو گئی۔ پہلے جب کوئی اس طرح کی بات کرتا تھا تو میں بیچ سڑک پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جی چاہتا کہ لوگوں کو پکڑ کر شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دوں... کس طرح پہلی شام الگ الگ کھڑے رہ کر ہم نے ایک دوسرے کا انتظار کیا تھا۔ وہ پب کے سامنے میں مجسمے کے نیچے۔ کس طرح اس نے پہلی بار مجھے پیڑ کے تنے سے لگا کر چوما تھا۔ کس

طرح پہلی بار میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے بالوں کو چھُوا تھا۔ جی ہاں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جب تک یہ سچائی میں انھیں بتا نہیں دوں گی اس وقت تک اس رات کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکوں گی جس رات پہلی بار میرے اندر کھٹکا ہوا تھا اور برسوں بعد یہ خواہش ہوئی تھی کہ اس کمرے سے بھاگ جاؤں جہاں میرے ماں باپ سوئے ہوئے تھے ... لیکن وہ کمرہ خالی تھا۔ جی! میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدھی رات کو آنکھ کھل جانے پر آپ کے چیخنے چلّانے پر بھی اگر دوسرے کمرے سے کوئی نہ آئے تو سمجھیے کہ وہ خالی ہے۔ دیکھیے! اس رات کے بعد میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔

لیکن ایک بات ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب زلزلے یا بمباری کی خبریں اخباروں میں چھپتی ہیں تو دوسرے ہی دن معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں بچّوں کا اسکول تھا وہاں اب کھنڈر ہیں اور جہاں کھنڈر تھے وہاں خاک اُڑتی ہے۔ لیکن جب لوگوں کے ساتھ وہ ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہوا تو کسی کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس رات کے بعد میں سارے شہر میں اکیلے گھومتی رہی اور پہلی بار اس پارک میں آکر جب اس بنچ پر بیٹھی جس پر آپ بیٹھے ہیں تو کسی نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ اور ہاں اس دن تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں اسی گرجا گھر کے سامنے بیٹھی ہوں جہاں میری شادی ہوئی تھی ... اس وقت سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ ہماری گھوڑا گاڑی سیدھی گرجا گھر کے سامنے پہنچ کر رک سکے۔ ہم دونوں پیدل چل کر یہاں آئے تھے ...

آپ آرگن پر موسیقی سن رہے ہیں؟ دیکھیے انھوں نے دروازے کھول دیئے ہیں۔ موسیقی کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ اسے سنتے ہی مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو چوما ہے۔ ایک دوسرے سے انگوٹھیاں بدلی ہیں۔ بس اب تھوڑی سی دیر اور ہے — وہ باہر آنے والے ہیں۔ لوگوں میں اتنا صبر کہاں کہ سکون سے کھڑے رہیں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو بے جھجک چلے جائیں میں تو یہاں بیٹھی ہی ہوں۔ آپ کے بچے کو دیکھتی رہوں گی۔ کیا کہا آپ نے؟ جی ہاں دن ڈھلنے تک یہیں رہتی ہوں۔ پھر یہاں سردی بڑھنے لگتی ہے۔ دن بھر یہی دیکھتی رہتی ہوں کہ دھوپ کا ٹکڑا کس بنچ پر ہے اور اسی پر جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ پارک کا ایسا کوئی کونا نہیں جہاں میں گھڑی دو گھڑی بیٹھتی نہ ہوں۔ لیکن یہ بنچ مجھے سب سے اچھی لگتی ہے۔ ایک تو اس پر پتّے نہیں گرتے اور دوسرے ... ارے آپ جا رہے ہیں؟

دوسری دنیا

کئی برس پہلے ایک ایسی لڑکی کو جانتا تھا جو دن بھر پارک میں کھیلا کرتی تھی۔ اس پارک میں بہت سے پیڑ تھے جن میں سے بہت کم کو میں پہچانتا تھا۔ سارا دن لائبریری میں رہنے کے بعد شام کو جب میں لوٹتا تو وہ پیڑوں کے بیچ بیٹھی دکھائی دیتی۔ بہت دنوں تک ہم ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوئے۔ میں لندن کے اس علاقے میں کچھ ہی دن کے لیے ٹھہرا تھا۔ ان دنوں سستے مکان کی تلاش میں مَیں اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا تھا۔

وہ بہت مفلسی کے دن تھے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ وہ لڑکی بھی بہت غریب رہی ہوگی۔ بس ایک سوئٹر پہنے رہتی اور اس کے سر پر کتھئی رنگ کا کنٹوپ ہوتا جس کے دونوں کناروں سے اس کے بال نکلے رہتے۔ وہ آخر اکتوبر کے دن تھے جب سردیاں شروع ہونے والی تھیں اس لیے اس کی ناک اور کان سرخ ہو جاتے۔ شروع کے یہ دن کبھی کبھی اصل سردیوں سے بھی زیادہ سخت ہوتے تھے۔

سچ کہوں تو ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ہی میں لائبریری آتا تھا۔ ان دنوں میرا کمرہ برف ہو جاتا تھا۔ رات کو سونے سے قبل میں اپنے سارے سوئٹر اور جرّابیں پہن لیتا تھا اور رضائی کے اوپر اپنے اوورکوٹ اور چیسٹر ڈال لیتا تھا۔ لیکن ٹھنڈ پھر بھی نہیں جاتی تھی۔ کمرے میں ہیٹر تھا لیکن اسے چلانے کے لیے اس میں ایک شلنگ ڈالنا پڑتا تھا۔ پہلی بار جب میں اس کمرے میں سویا تو رات بھر اس ہیٹر میں پیسے ڈالتا رہا۔ ہر آدھ گھنٹے بعد اس کے پیٹ کی آگ خاموش کرنا پڑتی تھی۔ دوسرے دن میرے پاس ناشتے تک کے پیسے نہیں بچتے تھے۔ اس کے بعد سے میں نے اس ہیٹر کو

استعمال نہیں کیا۔ میں رات بھر ٹھنڈ سے کانپتا رہتا لیکن ہیٹر کی طرف سے اطمینان رہتا کہ وہ بھی بند پڑا ہے۔ وہ میز پر ٹھنڈا پڑا رہتا اور میں بستر پہ اور اس طرح ہم دونوں کے بیچ سرد جنگ جاری رہتی۔

صبح ہوتے ہی جلدی جلدی تیار ہو کر لائبریری چلا جاتا۔ پتہ نہیں میری طرح کتنے لوگ وہاں آتے اور لائبریری کھلنے سے پہلے ہی دروازے کے سامنے لائن لگا کر کھڑے ہو جاتے۔ ان میں زیادہ تر بوڑھے ہوتے تھے جنھیں پنشن تو بہت کم ملتی تھی لیکن سردی سب سے زیادہ لگتی تھی۔ وہ میزوں پر ایک دو کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے۔ کچھ ہی دیر بعد میں دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں سب لوگ سو رہے ہیں۔ کوئی انھیں ٹوکتا نہیں تھا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد لائبریری کا کوئی ملازم ادھر کا چکّر لگا جاتا اور کھلی ہوئی کتابوں کو بند کر دیتا پھر ان لوگوں کو ہلکے سے ٹھوکا دے دیتا جن کے خرّاٹے دوسروں کی نیند یا مطالعے میں خلل پیدا کرتے۔

ایسی ہی ایک اونگھتی دوپہر میں مَیں نے لائبریری کی لمبی کھڑکی سے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنا بستہ ایک بنچ پر رکھ دیا تھا اور خود پیڑوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اس دن دھوپ نہیں نکلی تھی اس لیے مجھے تعجب ہوا کہ وہ اتنی ٹھنڈ میں باہر کھیل رہی ہے۔ لڑکی بالکل اکیلی تھی۔ دوسری بنچیں خالی پڑی تھیں۔ اس دن پہلی بار مجھ میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہوئی کہ وہ کون سے کھیل ہیں جنھیں کچھ بچّے تنہائی میں کھیلتے ہیں۔

دوپہر ہوتے ہی وہ پارک میں آجاتی، بنچ پر اپنا بستہ رکھ دیتی اور پھر پیڑوں کے پیچھے بھاگ جاتی۔ کبھی کبھی کتاب سے سر اُٹھا کر میں اس کی طرف دیکھ لیتا۔ پانچ بجتے ہی سرکاری ہسپتال کا گجر سنائی دیتا اور گجر بجتے ہی وہ لڑکی جہاں بھی ہوتی دوڑتی ہوئی آکر اپنی بنچ پر بیٹھ جاتی اور بستے کو گود میں لیے اس وقت تک چپ چاپ بیٹھی رہتی جب تک کہ دوسری طرف سے ایک عورت آتی ہوئی نہ دکھائی دیتی۔ میں کبھی ان خاتون کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔ وہ ہمیشہ نرسوں کی سفید پوشاک میں ملبوس آتی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ اس بنچ تک پہنچیں وہ لڑکی تیزی سے ان کی طرف لپکتی اور انھیں بیچ ہی میں روک لیتی۔ وہ دونوں پھاٹک کی طرف مڑ جاتے اور مَیں انھیں اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔

میں کھڑکی سے باہر جہاں یہ پنٹومم روز دہرایا جاتا تھا، ہچکاک کے ہیرو کی طرح سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ یہ سلسلہ شائد سردیوں تک چلتا رہتا اگر ایک دن اچانک موسم نے کروٹ نہ بدل لی ہوتی۔

ایک رات سَوتے میں اچانک مجھے اپنی رضائی اور اس پر رکھے ہوئے کوٹ بہت بھاری معلوم ہوئے۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا جیسے مَیں بہت دنوں بعد بخار سے اُٹھا ہوں کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ ٹھنڈ نہ کہرا۔ لندن کا آسمان نیلی مخملی ڈبیا سا کھُلا تھا جس میں کسی نے ڈھیر سے تارے بھر دیئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ گرمیوں کی رات ہے اور میں پردیس میں نہ ہوکر اپنے گھر کی چھت پر لیٹا ہوں۔

اگلے روز کھُل کر دُھوپ نکلی تھی۔ میں زیادہ دیر تک لائبریری میں نہیں بیٹھ سکا۔ دوپہر ہوتے ہی وہاں سے باہر نکل آیا اور گھومتا ہوا اس ریستوراں میں جا پہنچا جہاں روز کھانا کھانے جاتا تھا۔ وہ ایک سستا سا یہودی ریستوراں تھا جہاں صرف ڈیڑھ شلنگ میں کوشر، گوشت، دو روٹیاں اور بیئر کا ایک چھوٹا سا گلاس مل جاتا تھا۔ ریستوراں کی یہودی مالکن جو جنگ سے پہلے لیتھونیا سے آئی تھی ایک اونچے سے اسٹول پر بیٹھی رہتی۔ کاؤنٹر پر غلّہ رکھا رہتا اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک سفید سیامی بلّی گاہکوں کو گھورتی رہتی۔ شائد وہ مجھے کچھ کچھ پہچاننے لگی تھی کیونکہ جتنی دیر مَیں کھانا کھاتا رہتا اتنی دیر وہ میری ہی طرف دیکھتی رہتی۔ ان دنوں میں سوچا کرتا تاکہ مفلسی، ٹھنڈ اور تنہائی کے دنوں میں بلّی کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ مَیں یہ بھی سوچتا تھا کہ کسی دن مَیں بھی اسی طرح کا ایک ہندستانی ریستوراں کھولوں گا اور ایک ساتھ تین بلّیاں پالوں گا۔

ریستوراں سے باہر آیا تو دوبارہ لائبریری جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ اس دن ایک عرصے بعد گھر سے خط اور اخبار آئے تھے۔ میں انھیں پارک کی کھُلی دُھوپ میں بیٹھ کر پڑھنا چاہتا تھا۔ نظر اٹھا کر پارک کے پھولوں کو دیکھا تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ وہ پھول بہت چھوٹے تھے اور گھاس میں اپنا سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ شائد انھیں پھولوں کے بارے میں یسوع مسیح نے کہا تھا Lilies of the field ایسے پھول جو آنے والے دنوں کے بارے میں نہیں سوچتے۔

وہ گزری ہوئی گرمیوں کی یاد دلاتے تھے۔

میں گھاس کے درمیان ان پھولوں پر چلنے لگا۔

اس طرح چلنا مجھے بہت اچھا لگا۔ مَیں آنے والے دنوں کی فکروں سے آزاد ہو گیا اور خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا۔ میں نے اپنے جوتے اُتار دیئے اور گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگا۔ ابھی بنچ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنی پشت پر ایک چیخ سنائی دی۔ کوئی تیزی سے بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی دکھائی دی۔ وہ پیڑ کی آڑ سے نکل کر باہر آئی اور میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"یو آر کاٹ" اُس نے ہنستے ہوئے کہا "اب آپ جا نہیں سکتے۔"

میں کچھ سمجھ نہ پایا۔ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔

"آپ پکڑے گئے۔ اس نے دوبارہ کہا "آپ میری زمین پر کھڑے ہیں"۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ گھاس پر پھول تھے، کنارے پر خالی بنچیں تھیں۔ بیچ بیچ میں شاداب درخت اور ایک موٹے تنے والا اوک کھڑا تھا جس کی جڑیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"مجھے معلوم نہیں تھا" میں نے کہا اور مُڑ کر واپس جانے لگا۔

"نا نا... آپ جا نہیں سکتے" بچّی بالکل میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "وہ آپ کو جانے نہیں دیں گے!"

"کون جانے نہیں دے گا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا جو سچ مچ سپاہی معلوم ہو رہے تھے۔ لمبے تڑنگے، ہٹّے کٹّے پہریدار، میں سوچے سمجھے بغیر ان کے غیر مرئی دام میں اسیر ہو گیا تھا۔

کچھ دیر تک چپ چاپ ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ اس کی آنکھیں مسلسل مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں ـــ شوخ اور چوکنّی۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو وہ کچھ نرم پڑی۔

"آپ چھوٹنا چاہتے ہیں؟" اس نے کہا

"کس طرح؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"انھیں کھانا کھلانا ہوگا۔ یہ بہت دنوں سے بھوکے ہیں۔" اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا جو ہوا میں سر ہلا رہے تھے۔

"کھانا میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ چاہیں تو لا سکتے ہیں۔ یہ صرف پھول پتّے کھاتے ہیں۔"

پھول پتّوں کا لانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ اکتوبر کے دن تھے اور پارک میں پھولوں کے علاوہ ڈھیروں پتّے بکھرے ہوئے تھے۔ میں انھیں جمع کرنے کے لیے نیچے جُھکا ہی تھا کہ اس نے میرا ہاتھ روک لیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ یہاں سے نہیں۔ یہ میری زمین ہے۔ آپ کو وہاں جانا ہوگا۔" اس نے پارک کے خاردار تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں مُرجھائے ہوئے پھول پتّوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں اس ڈھیر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کی آواز سنائی دی۔

"ٹھہریے!! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ لیکن اگر آپ نے بھاگنے کی کوشش کی تو... یہیں مر جائیں گے۔" وہ رُکی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "آپ مرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اتنا گرم اور اُجلا دن تھا کہ مرنے کی خواہش مجھے بالکل نہیں ہوئی۔

ہم دونوں خاردار تاروں تک گئے۔ میں نے رومال نکالا اور پھول پتّیوں کو بٹورنے لگا۔ نجات پانے کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔

لوٹتے وقت وہ چپ رہی۔ میں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ بہت بیمار نظر آرہی تھی۔ ان بچّوں کی طرح سنجیدہ جو تنہائی میں خود ہی سے کھیلتے رہتے ہیں۔ جب وہ چُپ رہتی تھی تو اس کے ہونٹ کھنچ جاتے تھے۔ نچلا ہونٹ تھوڑا سا باہر نکل آتا تھا جس کے اُوپر سُکڑی ہوئی ناک بے سہارا سی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بال بہت چھوٹے اور بہت کالے تھے جن میں دُھلی ہوئی روئی کی طرح چھلّے پڑے ہوئے تھے اور جنھیں چھونے کو ہاتھ بے اختیار آگے بڑھ جاتے تھے۔ لیکن وہ ہر طرح کے لمس سے آزاد معلوم ہوتی تھی۔

"اب آپ انھیں کھانا دے سکتے ہیں" اس نے کہا اور پیڑوں کے پاس آکر رک گئی۔

"کیا وہ مجھے چھوڑ دیں گے؟" میں کوئی ضمانت، کوئی یقین دہانی چاہتا تھا۔ اس بار وہ مُسکرائی اور میں نے پہلی بار اس کے دانتوں کو دیکھا جو حبشی لڑکیوں کی طرح بالکل سفید اور چمکیلے تھے۔

میں نے جمع کی ہوئی پتیاں رومال سے نکالیں، انھیں چار حصّوں میں تقسیم کیا اور برابر برابر پیڑوں کے نیچے ڈال دیا۔

میں آزاد ہو گیا تھا اور کچھ کچھ خالی سا بھی۔

میں نے جیب سے خطوط اور اخبار نکالے اور اس بنچ پر بیٹھ گیا جس پر اس کا بستہ رکھا تھا۔ وہ سیاہ چمڑے کا بیگ تھا جس میں اندر کتابیں بھری تھیں اور اوپر والی جیب سے آدھا کترا ہوا سیب باہر جھانک رہا تھا۔

اچانک وہ اوجھل ہو گئی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا تو اس کی فراک کا ایک کونا جھاڑیوں میں سے جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک خرگوش کی طرح وہاں دُبکی بیٹھی تھی۔ میری ہی طرح کے کسی بھولے بھالے مسافر پر جھپٹنے کے لیے۔ لیکن بہت دیر تک پارک میں سے کوئی نہیں گزرا۔ ہوا چلتی تو پیڑوں کے نیچے ڈھیر پتّیاں بھنور کی طرح ناچنے لگتیں اور وہ اپنے شکار کو بھول کر ان پتّیوں کے پیچھے بھاگنے لگتی۔

کچھ دیر بعد وہ بنچ کے قریب آئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا اور پھر بستے کی جیب سے سیب باہر نکال لیا۔ میں اخبار پڑھتا رہا اور اس آواز کو سنتا رہا جو سیب کترتے وقت اس کے دانتوں سے نکل رہی تھی۔

اچانک اس کی نگاہ میرے خطوں پر پڑی جو بنچ پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سیب کھاتے کھاتے رک گئی۔

"یہ آپ کے ہیں؟"

"ہاں" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اور یہ؟" اس نے لفافے پر چپکے ہوئے ٹکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

ٹکٹ پر ہاتھی کی تصویر تھی جس کی سونڈ اوپر ہوا میں اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دانتوں کے بیچ ہنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”تم کبھی عجائب گھر گئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک بار پاپا کے ساتھ گئی تھی۔ انھوں نے مجھے ایک پینی دی تھی اور ہاتھی نے میری ہتھیلی پر رکھی اس پینی کو اپنی سونڈ سے اُٹھالیا تھا۔“

”تم ڈری نہیں تھیں؟“

”نہیں کیوں؟“ اس نے سیب کُترتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”پاپا تمھارے ساتھ یہاں نہیں آتے؟“

”ایک بار آئے تھے تو تین بار پکڑے گئے۔“

وہ دھیمے سے یوں ہنسی جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہی نہ ہو یا جیسے کوئی اکیلے میں اس وقت مسکرا دیتا ہے جب کوئی یاد بہت سی تہیں کھول دیتی ہے۔

ہسپتال کا گجر سنائی دیا تو ہم دونوں چونکے۔ لڑکی نے بنچ سے بستہ اُٹھایا اور خاموش کھڑے ہوئے پیڑوں کے قریب پہنچ گئی۔ وہ ہر پیڑ کے قریب جاتی، اسے چھوتی اور کچھ کہتی جسے صرف درخت ہی سُن پاتے۔ پیڑوں سے گفتگو کرنے کے بعد وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے ہاتھ ملایا جیسے میں بھی ان درختوں میں سے ایک ہوں۔

پھر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وہاں وہی خاتون دکھائی دیں۔ نرسوں والی سفید پوشاک ہری گھاس پر چمک رہی تھی۔ بچّی انھیں دیکھتے ہی ان کی طرف دوڑی۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی خاتون تھیں جنھیں میں لائبریری کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ چھوٹا قد، کندھے پر تھیلا اور بچّی ہی کی طرح سیاہ گھنگھریالے بال۔ وہ دونوں مجھ سے کافی دور تھے لیکن ان کی آوازیں مجھے سنائی دے جاتی تھیں۔ لفظ صاف صاف سمجھ میں نہ آتے صرف دو آوازوں کی ایک آہٹ سی محسوس ہوتی۔ دونوں گھاس پر بیٹھ گئے تھے۔ بچّی مجھے بھول چکی تھی۔

میں نے جوتے پہنے، اخبار اور خط جیب میں رکھے پھر سوچا ابھی کافی وقت ہے اس لیے ایک دو گھنٹے لائبریری ہی میں گزارے جائیں —— پارک کے سحر سے دور اپنے گوشۂ تنہائی میں۔

میں پارک کے بالکل بیچ میں تھا۔ درختوں کی چوٹیوں پر آگ سی روشن ہونے لگی تھی۔ سارا پارک سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ بیچ میں پتّوں کا دریا بہہ رہا تھا جس کی موجیں ہوا سے ہل رہی تھیں۔

”کون ۔؟ کون ہے ؟“ کوئی مجھے بلا رہا تھا۔ میں رُکا نہیں چلتا رہا۔ کبھی کبھی آدمی اپنے آپ کو بُلانے لگتا ہے۔ باہر سے اندر اور اندر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بلاوا اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ آواز مسلسل آتی رہی۔ آخر مجھے رُکنا ہی پڑا۔ اس بار کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ واقعی کوئی چیخ رہا تھا۔ اسٹاپ … اسٹاپ … میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ لڑکی دونوں ہاتھ ہوا میں ہلا رہی تھی۔

میں پھر پکڑا گیا۔ احمقوں کی طرح چند پیڑوں میں گھرا ہوا میں دوبارہ اس کی زمین پر چلا آیا تھا۔ اس بار ماں اور بیٹی دونوں ہنس رہے تھے۔

یہ وہ دن تھے جب گرمی پڑتی نہیں تھی صرف محسوس ہوتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ یہ موسم زیادہ دن تک نہیں رہے گا۔ لائبریری سنسان رہنے لگی تھی۔ میرے پڑوسی پنشن یافتہ لوگ اب باہر دھوپ میں بیٹھنے لگے تھے آسمان اس قدر نیلا ہوتا تھا کہ لندن کی دھوپ بھی اسے میلا نہ کر پاتی۔ پارک اس آسمان کے نیچے کسی سبز جزیرے کی طرح لیٹا رہتا۔

گریتا (یہی اس کا نام تھا) ہمیشہ وہاں دکھائی دیتی تھی اور کبھی نظر نہ بھی آتی تو بنچ پر اس کا بستہ دیکھ کر پتہ چل جاتا کہ وہ یہیں کہیں کسی کونے میں دُبکی ہوئی ہے۔ میں درختوں، جھاڑیوں اور جنگلی پھولوں سے بچتا ہوا آتا۔ ہر روز وہ کہیں نہ کہیں ایک خوفناک غیر مرئی پھندہ چھوڑ جاتی اور پوری ہوشیاری کے باوجود جب میں اس میں پھنس جاتا تو وہ چیختی ہوئی میرے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی۔ میں پکڑ لیا جاتا، چھوڑ دیا جاتا اور پھر پکڑ لیا جاتا …

یہ کھیل نہیں تھا، ایک پوری دنیا تھی۔ اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ حالانکہ ڈرامے کے ایکسٹرا کی طرح میں کبھی کبھی اس میں شریک کرلیا جاتا تھا۔ مجھے ہمیشہ تیار رہنا پڑتا تھا کیونکہ وہ کسی بھی وقت بلا سکتی تھی۔ ایک دوپہر ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تھے۔ اچانک وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہیلو مسٹر ٹامس“، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج آپ بہت دن بعد دکھائی دیے۔“

ان سے ملیے، یہ میرے انڈین دوست ہیں۔"

میں بت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"آپ بیٹھے ہیں؟ ان سے ہاتھ ملائیے۔" اس نے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا۔

میں نے کھڑے ہو کر ہوا سے ہاتھ ملایا۔ گریتا کھسک کر میرے پاس آگئی تاکہ کونے میں مسز ٹامس بیٹھ سکیں۔

"آپ، بازار جا رہی تھیں" اس نے خالی جگہ کو دیکھتے ہوئے کہا "میں آپ کا تھیلا دیکھ کر سمجھ گئی۔ معاف کیجیے گا میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی مجھے بہت کام ہے۔ انھیں دیکھیے (اس نے درختوں کی طرف اشارہ کیا) یہ صبح سے بھوکے ہیں۔ میں نے ابھی تک ان کے لیے کھانا بھی نہیں تیار کیا۔ آپ چائے پئیں گی یا کافی؟ ہاں — آپ گھر سے پی کر آئی ہیں، کیا کہا؟ میں آپ کے گھر کیوں نہیں آتی ...؟ آج کل وقت کہاں ملتا ہے۔ صبح ہسپتال جانا پڑتا ہے۔ دوپہر کو بچوں کے ساتھ — آپ تو جانتی ہی ہیں۔ میں اِتوار کو آؤں گی۔ آپ جا رہی ہیں۔؟"

اس نے کھڑے ہو کر دوبارہ ہاتھ ملایا۔ مسز ٹامس شاید جلدی میں تھیں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ اس لیے انتقاماً میں بھی بنچ پر ہی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اچانک وہ چونک پڑی۔

"آپ کچھ سُن رہے ہیں؟" اس نے مجھے جھنجھوڑا۔

"نہیں"، میں نے کہا۔

"فون کی گھنٹی کتنی دیر سے بج رہی ہے۔ ذرا دیکھیے کون ہے؟"

میں اُٹھ کر بنچ کے پیچھے گیا۔ گھاس پر سے ایک ٹوٹی ٹہنی اُٹھائی اور زور سے کہا "ہیلو!"

"کون ہے —؟" اس نے قدرے بے صبری سے پوچھا۔

"مسز ٹامس"، میں نے کہا۔

"ارے۔ پھر مسز ٹامس" اس نے اس طرح جماہی لی جیسے بہت تھکی ہوئی ہو۔ پھر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے ہاتھ سے ٹہنی چھین کر کہا "ہیلو مسز ٹامس، آپ بازار سے لوٹ آئیں۔ کیا کیا لائی ہیں۔ میٹ بالس، فش فنگرس، آلو کے چپس؟" اس کی آنکھیں

حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ چن چن کر ان چیزوں کے نام لے رہی تھی جو اسے سب سے زیادہ اچھی لگتی تھیں۔

پھر وہ چپ ہو گئی — جیسے مسز ٹامس نے اس کے سامنے کوئی غیر متوقع تجویز رکھ دی ہو "ٹھیک ہے مسز ٹامس، میں ابھی آتی ہوں۔ نہیں مجھے دیر نہیں لگے گی۔ میں اسی وقت بس اسٹیشن پہنچ رہی ہوں۔ گڈ بائی، مسز ٹامس! اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"مسز ٹامس نے مجھے ڈنر پر بلایا ہے — آپ کہاں جائیں گے؟"

"میں سوؤں گا۔"

"پہلے انھیں کچھ کھلا دینا... نہیں تو یہ روئیں گے۔" اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ٹھہری ہوئی ہوا میں ساکت کھڑے تھے۔

وہ مسز ٹامس کے یہاں جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا۔ جھوٹ موٹ کا پاؤڈر لگایا۔ ہتھیلی کو آئینہ بنا کر اس میں خود کو دیکھا۔ کھلی ہوئی دھوپ اور پیڑوں کی چھاؤں کے بیچ بیٹھی وہ سچ مچ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

جاتے وقت اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور جب تک وہ پیڑوں اور جھاڑیوں کے جھرمٹ میں غائب نہیں ہو گئی میں اسے دیکھتا رہا۔

ایسا ہر روز ہونے لگا۔ وہ مسز ٹامس سے ملنے چلی جاتی اور میں بنچ پر لیٹا رہتا۔ مجھے تنہائی کا احساس نہ ہوتا۔ پارک کی انوکھی اور غیر مرئی آوازیں مجھے ہر وقت گھیرے رہتیں۔ میں ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں چلا جاتا۔ وہ پارک کے دور افتادہ کونوں میں بھٹکتی پھرتی میں لائبریری کی کتابوں کا تکیہ بنا کر بنچ پر لیٹا لندن کے بادلوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ آسمان میں اُڑتے رہتے اور جب کوئی سفید ٹکڑا سورج کی آڑ کر لیتا تو پارک میں اندھیرا سا ہو جاتا۔

اسی زمانے میں ایک دن جب میں بنچ پر لیٹا تھا، مجھے اپنے قریب ایک عجیب سی آہٹ سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں خواب میں مسز ٹامس کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے قریب، بالکل قریب آ کر کھڑی ہو گئی ہیں اور مجھے پکار رہی ہیں۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ سامنے بچّی کی والدہ کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے گریتا کا ہاتھ پکڑ

رکھا تھا اور قدرے جھجکتے ہوئے وہ مجھے جگا رہی تھیں۔

"معاف کیجیے... انھوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ آپ سو تو نہیں رہے تھے؟"

میں کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آج آپ جلدی آگئیں؟" میں نے کہا۔ ان کی سفید پوشاک، کالی بیلٹ اور بالوں پر بندھے اسکارف کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ ہسپتال سے سیدھی اسی طرف چلی آرہی ہیں۔

"ہاں، میں جلدی آگئی۔ وہ مسکرانے لگیں۔ ہفتے کو کام زیادہ نہیں رہتا میں دوپہر میں آجاتی ہوں"

وہ ویسٹ انڈیز کے اس لہجے میں بول رہی تھیں جس میں ہر لفظ کو کھینچ کر ادا کرتے ہیں اور جس میں ہر لفظ کا آخری حصّہ غبّارے کی طرح اڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

"میں آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ آج آپ چائے ہمارے ساتھ پئیں گے؟... ہم لوگ پاس ہی میں رہتے ہیں"

ان کے لہجے میں کوئی جھجک یا دکھاوا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے مدّت سے جانتی ہوں۔ میں تیار ہوگیا۔ اپنے بڈسٹر سے لائبریری اور پارک تک کا چکّر لگانے کے سوا میں عرصے سے کسی اور کے گھر نہیں گیا تھا۔ میں قریب قریب بھول چکا تھا کہ اس سے الگ بھی کوئی اور دنیا ہے جہاں گریتا رہتی ہے، کھاتی ہے اور سوتی ہے۔

وہ آگے آگے چل رہی تھیں۔ کبھی کبھی مُڑ کے دیکھ لیتی تھیں کہ ہم بہت پیچھے تو نہیں رہ گئے۔ گریتا کو میرا اپنے گھر آنا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ عجیب مجھے بھی لگ رہا تھا ـــ اس کے گھر جانا نہیں بلکہ اس کی ماں کے ساتھ چلنا۔ اپنے قد کی وجہ سے وہ بہت کم عمر معلوم ہوتی تھیں۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ اتنی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں کہ گمان ہوتا تھا کہ میں کسی دوسری گریتا کے ساتھ چل رہا ہوں۔

راستے بھر وہ چپ رہیں لیکن جیسے ہی ان کا گھر سامنے آیا وہ ٹھٹھک گئیں۔

"آپ بھی تو کہیں پاس ہی رہتے ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

”برائڈ اسٹریٹ پر“ میں نے کہا ”ٹیوب اسٹیشن کے بالکل سامنے۔“

”آپ شائد حال ہی میں آئے ہیں۔“ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس علاقے میں بہت کم انڈین رہتے ہیں۔“

وہ نیچے اُترنے لگیں۔ ان کا گھر بیسمنٹ میں تھا اس لیے ہمیں سیڑھیاں اُتر کر نیچے جانا پڑا۔ بچّی دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ کمرے میں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ روشنی ہوئی تو وہاں تین چار کرسیاں نظر آئیں۔ بیچ میں ایک بہت لمبی سی خالی میز اس طرح پڑی تھی جیسے اس پر پنگ پانگ کھیلی جاتی ہو۔ دیوار سے لگا ہوا ایک صوفہ پڑا تھا جس کے ایک کنارے پر ایک رضائی لپٹی رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھانے اور سونے کے علاوہ یہ کمرہ مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

”آپ بیٹھیے۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ پردہ اُٹھا کر اندر چلی گئیں۔ میں اور گریتا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہے۔ ہم دونوں پارک کے خزاں رسیدہ اُجالے میں ایک دوسرے کو پہچاننے لگے تھے۔ لیکن کمرے کے اندر نہ کوئی موسم تھا نہ کوئی طلسم۔ اس وقت گریتا ایک ایسی بچّی بن گئی تھی جس کا رعب اور سحر دونوں ختم ہو چکے تھے۔

”تم یہاں سوتی ہو؟“ میں نے صوفے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یہاں نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا کمرہ اندر ہے، آپ دیکھیں گے؟“

کچن سے آگے ایک کوٹھری تھی جو پہلے شاید گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ وہاں ایک نیلی چق پڑی تھی۔ اس نے چق ہٹائی اور دبے پاؤں اندر چلی آئی۔

”چپکے سے آئیے — وہ سو رہا ہے۔“

”کون؟“

”شی...“ اُس نے اپنی انگلی کو ہونٹوں پر رکھتے ہوئے آواز نکالی۔

میں نے سوچا کوئی اندر ہے۔ لیکن اندر بالکل سنّاٹا تھا۔ کمرے کی دیواریں سبز تھیں اور اور ان پر جانوروں کی تصویریں چپکی تھیں۔ کونے میں اس کا کھٹولا پڑا تھا۔ اس کھٹولے میں تھگلیوں

میں لپٹا ایک بھالو لیٹا تھا — گدڑی کے لال جیسا۔

”وہ سو رہا ہے۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”اور تم؟“ میں نے کہا۔ ”تم یہاں نہیں سوتیں؟“

”یہیں سوتی ہوں۔ جب پاپا یہاں تھے تو دوسرے پلنگ پر وہ سوتے تھے۔ ماں نے اب اس پلنگ کو باہر رکھوا دیا ہے۔“

”کہاں رہتے ہیں وہ؟“ اس بار میری آواز بھی دھیمی ہو گئی۔ بھالو کے ڈر سے نہیں بلکہ اس ڈر سے جو کئی دنوں سے مجھے گھیرے ہوئے تھا۔

”اپنے گھر میں رہتے ہیں اور کہاں؟“

اس نے قدرے تعجب سے مجھے دیکھا۔ جیسے مجھے پوری طرح یقین نہ آیا ہو۔ وہ اپنی میز کے پاس گئی جس پر اس کی اسکول کی کتابیں رکھی تھیں۔ میز کی دراز کھولی اور اندر سے خطوں کا پلندہ باہر نکالا جس پر ریشم کا لال فیتہ بندھا تھا گویا وہ کرسمس کا کوئی تحفہ ہو۔ وہ خطوں کو اٹھا کر میرے پاس لے آئی اور سب سے اوپر والے لفافے پر لگا ہوا ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا

”وہ یہاں رہتے ہیں۔“

مجھے یاد آیا کہ وہ میری نقل کر رہی ہے — کچھ دن پہلے میں نے بھی پارک میں اسے اپنے ملک سے آیا ہوا خط دکھایا تھا۔

ڈرائنگ روم سے اس کی ماں ہمیں بلا رہی تھی۔ آواز سنتے ہی وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں اس کمرے کی چیزیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا۔ کھٹولے پر بھالو سو رہا تھا۔ دیواروں پر جانوروں کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ بستر کے پاس ہی ایک چھوٹا سا بیسن تھا جس پر اس کا ٹوتھ برش، صابن اور کنگھا رکھا تھا۔ میں نے سوچا سب کچھ میرے بڈ سٹ کی طرح ہے لیکن اس سے بہت مختلف۔ میں اپنا کمرہ چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن اس کا کمرہ اپنی چیزوں میں ضم معلوم ہوتا تھا۔

میز پر ریشمی ڈوری میں بندھا خطوں کا پلندہ پڑا تھا، جسے جلدی میں وہ میرے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔

"کمرہ دیکھ لیا آپ نے" گریتا کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں جو بھی آتا ہے یہ سب سے پہلے اسے اپنا کمرہ دکھاتی ہے۔"

وہ کپڑے بدل آئی تھیں۔ لال چھینٹ کی اسکرٹ اور کھلا کھلا بھورے رنگ کا کارڈیگن۔ کمرہ معمولی عطر کی خوشبوؤں سے بھرا تھا۔

چائے کے نام پر آپ نے تو پوری دعوت کر دی۔ میں نے میز پر سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ توس، مربّہ، مکھن، پنیر۔ یاد نہیں کہ اتنی بہت سی چیزیں میں نے کب دیکھی تھیں۔

"ہسپتال سے لے آتی ہوں۔ وہاں سستی مل جاتی ہیں۔"

وہ پریشان نظر آتی تھیں۔ ان کی ہنسی میں افسردگی شامل رہتی۔ پتہ نہیں بچّی کہاں تھی۔ وہ اسے چیخ چیخ کر بلا رہی تھیں اور چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

وہ سر پکڑے بیٹھی رہیں۔ پھر یاد آیا کہ میں بھی ہوں۔ "آپ شروع کیجیے، وہ باغ میں بیٹھی ہوگی۔"

"آپ کا اپنا باغ ہے" میں نے پوچھا۔

"بہت چھوٹا سا۔ کچن کے پیچھے" جب ہم یہاں آئے تھے تو اُجاڑ پڑا تھا۔ میرے شوہر نے اسے صاف کیا۔ اب تھوڑی بہت سبزی بھی اُگ آتی ہے۔"

"آپ کے شوہر یہاں نہیں رہتے؟"

"انہیں یہاں کام نہیں ملا۔ دن بھر پارک میں گھومتے رہتے تھے۔ وہی عادت گریتا کو بھی پڑ گئی ہے..."

ان کی آواز میں ہلکی سی نقاہت تھی جس میں جھنجھلاہٹ بالکل نہیں تھی۔ لیکن یہ نقاہت اڑتی ہوئی گرد کی طرح تھی جو ہر چیز پر بیٹھ جاتی ہے۔

"پارک میں تو میں بھی گھومتا ہوں" میں نے اُن کا دکھ بانٹنا چاہا۔ اور ہوا بھی یہی۔ وہ ہنسنے لگیں۔

آپ کی بات الگ ہے۔ انھوں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا "آپ اکیلے ہیں۔ لیکن لندن میں اگر بال بچے بھی ساتھ ہوں تو بغیر نوکری کے گزارا مشکل ہے۔

وہ برتن صاف کرنے لگیں اور میں انہیں سمیٹ کر کچن میں رکھ آیا۔ سنک کے اوپر کھڑکی تھی جہاں سے ان کا باغ دکھائی دیتا تھا۔ بیچ میں ایک بیدِ مجنوں کھڑا تھا جس کی شاخیں الٹی چھتری کی تیلیوں کی طرح جھول رہی تھیں۔

پیچھے مڑا تو گریتا کی ماں دکھائی دیں۔ وہ دروازے پر تولیہ لیے کھڑی تھیں۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”آپ کے باغ کو... بہت چھوٹا تو نہیں ہے۔“

”جی ہاں — لیکن اس درخت نے ساری جگہ گھیر رکھی ہے۔ میں اسے کٹوانا چاہتی تھی مگر وہ اپنی ضد پر اڑ گئی۔ جس دن پیڑ کٹنا تھا، وہ رات بھر روتی رہی۔“ وہ چپ ہو گئیں۔ جیسے اس رات کو یاد کر کے رو پڑیں گی۔

”کیا کہتی تھی؟“

”کہتی کیا تھی۔ اپنی ضد پر اڑی تھی۔ بہت پہلے اس کے باپ نے کہا تھا کہ پیڑ کے نیچے سمر ہاؤس بنائیں گے۔ اب آپ ہی بتائیے یہاں خود رہنے کے لیے جگہ نہیں۔ باغ میں گڑیوں کا سمر ہاؤس کہاں سے بنے؟“

”سمر ہاؤس؟“

”ہاں — سمر ہاؤس — جہاں گریتا اپنے بھالو کے ساتھ رہے گی۔“

وہ ہنسنے لگیں۔ ایک افسردہ سی ہنسی جو ایک خالی جگہ سے اُٹھ کر دوسری خالی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے اور بیچ کی جگہ کو بھی خالی چھوڑ جاتی ہے۔

میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا لیکن گریتا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے آئے۔ لندن کی میلی دھوپ پڑوس کی چمنیوں پر رینگ رہی تھی۔

رخصت ہوتے وقت جب میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انھوں نے جھجکتے ہوئے کہا ”آپ کل خالی ہیں؟“

”میں تقریباً ہر روز خالی رہتا ہوں۔“

”کل اتوار ہے... انھوں نے کہا۔ گریتا کی چھٹی ہے لیکن میری ڈیوٹی ہے۔ کیا میں اسے

آپ کے پاس چھوڑ سکتی ہوں۔"

"کس وقت آنا ہوگا؟"

"نہیں آپ تکلیف نہ کریں۔ ہسپتال جاتے ہوئے میں اسے لائبریری میں چھوڑ دوں گی ... شام کو لوٹتے وقت لے لوں گی۔"

میں نے ہاں کر لی اور سڑک پر چلا آیا۔ کچھ دور چل کر جیب سے پیسے نکال کر انھیں گننے لگا۔ یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ آج کھانے کے پیسے بچ جائیں گے۔ میں نے بچی ہوئی ریزگاری کو مٹھی میں دبایا اور گھر کی طرف چل دیا۔

میں لائبریری کے دروازے پر کھڑا تھا۔ انہیں شاید سردی کی وجہ سے آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ دھوپ دور دور تک نہیں تھی۔ لندن کی عمارتوں پر پیلا اور زرد اُجالا ٹھہرا ہوا تھا۔ اس اُجالے میں وہ اور بھی مفلس اور مغموم نظر آتی تھیں۔

مجھے ان کی سفید پوشاک نظر آئی۔ دونوں پارک سے گزر کر آرہے تھے۔ آگے آگے وہ اور ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی گریتا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر ہوا میں ہاتھ ہلایا، بچّی کو جلدی سے چوما اور ہسپتال کی طرف مڑ گئیں۔ لیکن بچّی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے میرے پاس آئی۔ سردی سے اس کی ناک لال ہوگئی تھی۔ اس نے کتھئی رنگ کا پوری آستینوں والا سوئٹر پہن رکھا تھا اور سر پہ وہی پرانی ٹوپی تھی جو پارک میں پہن کر آئی تھی۔

وہ نڈھال سی کھڑی تھی۔

"چلوگی؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

اس نے چپ چاپ سر ہلا دیا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ پوچھے گی — کہاں؟ اور تب میں اسے حیرت میں ڈال دوں گا۔ لیکن اس نے کچھ نہ پوچھا اور ہم سڑک پار کرنے لگے۔

جب ہم پارک سے آگے بڑھے تو ایک بار اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے وہ کسی محفوظ حصار سے باہر جا رہی ہو۔ میں چپ رہا اور اس نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ اس وقت

مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ بچے جب ماں باپ کے ساتھ نہیں ہوتے تو سارے سوالوں کی پڑیا بنا کر اندھیرے گڈھے میں پھینک دیتے ہیں۔

ٹیوب میں بیٹھ کر وہ کچھ مطمئن سی نظر آئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"کیا ابھی سے رات ہو گئی؟" اس نے پوچھا۔

"رات؟"

"دیکھو باہر کتنا اندھیرا ہے۔"

"ہم زمین کے نیچے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر دھیرے سے کہا "نیچے رات ہے اوپر دن"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔

دھیرے دھیرے روشنی نظر آنے لگی۔ اوپر آسمان کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا اور پھر اتھاہ سفیدی میں ڈوبا ہوا دن سرنگ کے باہر نکل آیا۔

ٹیوب اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ رک گئی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"رک کیوں گئیں؟"

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

میں ڈرا اس لیے کہ ٹائلٹ نیچے تھا اور اس حالت میں بہت دور نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور انھیں سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ راہداری کے دوسرے سرے پر مردوں والا ٹائلٹ دکھائی دیا۔ میں جلدی سے اسے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر کے جب باہر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ نہیں میں آزاد ہو رہا ہوں۔

وہ باہر آئی تو پریشان سی نظر آئی "اب کیا بات ہے؟"

"زنجیر بہت اونچی ہے۔" اس نے کہا

"ٹھہرو میں کھینچ دیتا ہوں۔"

اس نے میرا کوٹ پکڑ لیا۔ زنجیر وہ خود کھینچنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ اندر گیا۔ اسے دوبارہ گود میں اٹھایا اور تب تک اٹھاتا گیا جب تک اس کا ہاتھ زنجیر تک نہیں پہنچ گیا۔ ہم دونوں حیرت سے فلش میں پانی کو بہتا دیکھتے رہے۔ جیسے یہ عجوبہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔

ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر آئے تو اس نے کَس کر میرا ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹریفلگر اسکوائر آگے تھا۔ چاروں طرف بھیڑ، اجالا، شور۔ میں اسے حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ڈر گئی تھی۔ وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ میرا جی چاہا کہ میں اسے دوبارہ نیچے لے جاؤں، ٹیوب اسٹیشن میں جہاں زمین کا اپنا محفوظ اندھیرا تھا۔ لیکن جلدی ہی (اس کا) ڈر جاتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ اسکوائر کے انوکھے اجالے میں کھو گئی تھی۔ وہ ان شیروں کے نیچے چلی آئی تھی جو کالے پتھروں پر اپنے پنجے کھولے ہوئے بھیڑ کو گھور رہے تھے۔ بہت سے بچے کبوتروں کو دانا ڈال رہے تھے۔

کبوتروں کے پَروں کا سایہ ایک بادل کی طرح معلوم ہوتا تھا جو کبھی اِدھر جاتا کبھی اُدھر اور کبھی سَر کے اوپر سے نکل جاتا اور کانوں میں صرف ایک گرم، سنسناتی پھڑپھڑاہٹ باقی رہ جاتی۔ وہ اس پھڑپھڑاہٹ کو سن رہی تھی اور مجھے بھول چکی تھی۔

میں اس کی نظر بچا کر اسکوائر کے بیچ میں چلا آیا۔ وہاں لال لکڑی کا ایک کیبن تھا جہاں دانے بکتے تھے۔ دانوں سے بھرے ایک پیالے کی قیمت چار پنس تھی۔ میں نے ایک پیالہ خریدا اور بھیڑ میں اسے ڈھونڈنے لگا۔

وہاں کبوتروں سے گھرے ہوئے بہت سے بچے تھے لیکن وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹی تھی۔ میں اس کے پیچھے گیا اور دانوں کا پیالہ اس کے آگے کر دیا۔

وہ مڑی اور سٹپٹا کر میری طرف دیکھا۔ بچوں میں شکر گزاری نہیں ہوتی۔ انہیں جو مل جاتا ہے لے لیتے ہیں اس کا اظہار کچھ بتائے یا جتائے بغیر ہی ہو جاتا ہے۔

اس نے پیالے کو میرے ہاتھوں سے تقریباً چھینتے ہوئے کہا "وہ آئیں گے؟"

"ضرور آئیں گے ... انہیں بلانے کے لیے ایک ایک دانا ڈالنا ہوگا۔ پھر..."

اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ اس طرف بھاگتی رہی جہاں اکّا دکّا کبوتر بھٹک رہے تھے۔ شروع میں اس نے ڈرتے ڈرتے ہتھیلی آگے بڑھائی۔ کبوتر اس کے پاس آتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ جیسے اس کا ڈر کبوتروں میں بھی سما گیا ہو۔ لیکن وہ خود کو زیادہ دیر تک نہ روک سکے۔ غمزے چھوڑ کر پاس آئے، اِدھر اُدھر دیکھنے کا بہانہ کیا اور پھر جلدی جلدی اس کی ہتھیلی سے دانے چگنے لگے۔ اب وہ اپنا فراک پھیلا کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک ہاتھ میں دونہ دوسرے ہاتھ میں دانے۔ میں اب اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پروں کے شور کرتے کاسنی شامیانے نے اسے ڈھک لیا تھا۔

میں بنچ پر بیٹھ کر فوّاروں کو دیکھنے لگا۔ جن کی پھوار اڑتی ہوئی گھٹنوں تک آ جاتی تھی۔ بادل اس قدر نیچے آ گئے تھے کہ نلسن کا سر صرف ایک سیاہ دھبّہ نظر آتا تھا۔

دن گزر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں میں نے دیکھا وہ سامنے کھڑی ہے۔

”میں ایک کپ اور لوں گی“ اس نے کہا۔

”اب نہیں۔ میں نے زرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب میں چائے پیوں گا اور تم آئس کریم کھاؤ گی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ایک کپ اور لوں گی۔“

اس کے لہجے میں ضد نہیں تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے خالی کپ لے لیا اور دوکان کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں دوکان کے پیچھے مڑ گیا۔ وہاں بھیڑ تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ کونے کی آڑ میں میں نے جیب سے پیسے نکالے۔ ان میں سے چائے آئس کریم اور ٹیوب کے کرائے کے پیسے الگ کیے۔ اب صرف دو پنس بچے تھے۔ میں نے چائے کے لیے الگ کیے ہوئے کچھ پنس اس میں ملائے اور دوکان کے سامنے لگی ہوئی لائن میں شامل ہو گیا۔

اس بار میں نے اسے کپ دیا تو اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ کپ لیتے ہوئے بھاگتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی جہاں سب سے زیادہ کبوتر تھے۔ وہ ان کے اور قریب گئی کبوتر بھی اس سے

مانوس ہونے لگے۔ وہ اڑتے ہوئے کبھی اس کے ہاتھوں پر، کبھی شانوں پر اور کبھی سر پر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد بخار سے پیدا ہونے والے کھنچاؤ میں تحلیل ہو گیا تھا اور وہ ہاتھ جو ہمیشہ مجھے بے جان سے معلوم ہوتے تھے عجیب سی بے چینی کے ساتھ کھلنے بند ہونے لگے تھے جیسے وہ کسی بھی وقت کبوتروں کی دھڑکنوں کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ دانوں کی کٹوری کس وقت خالی ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک ہوا میں ہتھیلی کھولے بیٹھی رہی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کبوتر اسے چھوڑ کر دوسرے بچّوں کے آس پاس منڈلانے لگے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور کسی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ میرے پاس چلی آئی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ پر شک کر رہی ہے۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب چلیں گے“ میں نے کہا۔

”میں ایک کپ اور لوں گی۔“

”نہیں۔ تم دو لے چکی ہو۔“ میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا ”معلوم ہے میرے پاس کتنے پیسے بچے ہیں؟“

”صرف ایک اور، اس کے بعد ہم چل دیں گے۔“

لوگ ہمیں دیکھنے لگے تھے اور میں اس سے دانوں کی ایک کٹوری کے لیے اُلجھ رہا تھا۔

”گریتا تم بہت ضِدّی ہو“ میں نے اسے بنچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

اس نے تاثر سے عاری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

”آپ برے آدمی ہیں، آپ کے ساتھ کبھی نہیں کھیلوں گی۔“ مجھے محسوس ہوا جیسے اس نے میرا موازنہ کسی غیر مرئی شخص سے کیا ہو۔ میں خالی خالی سا بیٹھا رہا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی امید باقی نہیں رہتی صرف اپنے ہونے پر شدید حیرت ہونے لگتی ہے۔ مجھے وہ آواز سُنائی دی جو آج بھی اکیلے میں سنائی دے جاتی ہے.... اور میں اسے سن کر مونہہ موڑ لیتا ہوں۔

وہ رو رہی تھی اس کے ہاتھ میں دانوں کی خالی کٹوری تھی۔ اور اس کی ٹوپی کھسک کر ماتھے

پر آگئی تھی۔ وہ چپ تھی لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کٹوری لے لی اور قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس بار پیسوں کا گننا بھی یاد نہ رہا۔ حالانکہ وہ مجھ سے بہت دور تھی اور کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور بچوں کی چیخوں کی وجہ سے کچھ بھی سنائی نہ دیتا تھا۔ پھر بھی میں اس کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔ لیکن ان سب سے دور میرے اندر کا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں اس کی رندھی ہوئی سانسیں تھیں جنھیں میں ناقابلِ عبور فاصلے سے بھی سن سکتا تھا۔

لیکن اس بار پہلے کی طرح نہیں ہوا۔ بہت دیر تک کوئی کبوتر اس کے پاس نہیں آیا۔ کچھ تو وہ گھبرائی ہوئی تھی اور کچھ اندھیرا بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ اس لیے کبوتر اس کے قریب تو آتے تھے لیکن اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی کو نظر انداز کر کے دوسرے بچوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ تھک ہار کر اس نے دانوں کی کٹوری زمین پر رکھ دی اور خود میرے پاس بنچ پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس کے جاتے ہی کبوتر کٹوری کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ دانوں کی کٹوری اوندھی پڑی ہے اور اس میں ایک دانہ بھی نہیں ہے۔

GHALIB ACADEMY
Acc
10,858

”اب چلو گی؟“ میں نے کہا

وہ فوراً بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے وہ اتنی دیر سے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں ایسی تابانی تھی جو آنسوؤں کے بہہ جانے کے بعد نظر آتی ہے۔

ان دنوں ٹریفلگر اسکوائر کے سامنے لائنس کا ریستوراں ہوا کرتا تھا۔ گندہ اور سستا.... سڑک پار کر کے ہم وہیں پہنچ گئے۔

اس بیچ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسوں کو گن لیا تھا۔ حساب لگا کر میں نے اس کے لیے دو ٹوسٹ منگوائے اور اپنے لیے چائے۔ آئس کریم کا خیال دل سے نکال دینا ہی مناسب تھا۔

وہ پہلی بار کسی ریستوراں میں آئی تھی۔ اس لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے کی ناراضگی ختم ہونے لگی ہے۔ اب ہم دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ پھر بھی یہ قربت پہلے کی سی نہیں تھی۔

کبوتروں کے پَروں کا سایہ اب ہمارے درمیان موجود تھا۔

"کیا میں بہت برا آدمی ہوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا پھر جلدی سے کہا "میں نے آپ کو نہیں کہا تھا"

"مجھ کو نہیں کہا تھا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "پھر کس کو کہا تھا"

"مسٹر ٹامس کو" وہ برے آدمی ہیں۔ ایک روز جب میں ان کے گھر گئی تو وہ مسز ٹامس کو ڈانٹ رہے تھے اور مسز ٹامس بے چاری رو رہی تھیں"

"اوہ" میں نے کہا۔

"آپ سمجھے کہ میں نے آپ کو کہا تھا؟"

وہ ہنس پڑی۔ جیسے میں نے واقعی بڑی احمقانہ بات کی ہو۔ اس کی ہنسی دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھنے لگا۔

"ہم یہاں دوبارہ آئیں گے؟" اس نے پوچھا۔

اس کا پوچھنا مجھے بُرا لگا۔ یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے کوئی لڑکی اپنے محبوب کا ذکر بار بار کرے۔ لیکن میں اسے دوبارہ مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ گرمیاں ابھی دور تھیں اور بیچ میں خزاں اور برف باری کے دن۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تک میرا جھوٹ کھل جائے گا۔

ہم باہر آئے تو زرد سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا حالانکہ دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے اسکوائر کی طرف دیکھا جہاں کبوتر اب بھی اڑ رہے تھے۔ میری جیب میں اب صرف ٹیوب کے کرائے بھر کے پیسے تھے۔ اس بار اس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ بچّے ایک حد کے بعد بڑوں کی مفلسی نہ سہی لیکن مجبوری پہچان لیتے ہیں۔

میں نے سوچا تھا کہ ریل میں میں اس سے سمر ہاؤس کے بارے میں پوچھوں گا اور اس بیدِ مجنوں کے بارے میں بھی جو اس کے باغ میں اکیلا کھڑا تھا۔ میں اسے دوبارہ اس کی اپنی دنیا میں لانا چاہتا تھا جہاں ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اپنی جگہ پر بیٹھتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ ٹریفلگر اسکوائر سے اسلنگٹن تک کا فاصلہ کافی

طویل تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرے شانوں پر اپنا سر ٹکا دیا اور نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اس بیچ میں نے ایک آدھ بار اس کے چہرے کو دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سوتے ہوئے وہ بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جیسا میں نے اسے پہلی بار پارک میں پیڑوں کے بیچ دیکھا تھا۔ ضدی، پُرسکون اور مکمل۔ کبوتروں کو دانہ کھلانے کی ضد اس نے چھوڑ دی تھی۔ آنسو کب کے خشک ہو چکے تھے۔ نیند میں وہ اتنی ہی مکمل نظر آتی تھی جتنی جھاڑیوں کے بیچ۔ اور اس وقت میرے دل میں عجیب سا خیال پیدا ہوا۔ پارک میں اس نے مجھے کئی بار پکڑا تھا۔ لیکن اس کے سوئے ہوئے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو ہمیشہ سے اسیر ہے۔ میرے جیسے لوگ تو کبھی کبھی گرفت میں آتے ہیں لیکن اسے اس کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا عطیّہ ہے۔ اس لیے کہ دوسروں کو ہمیشہ نجات اور آزادی کا وہم ہوتا ہے جب کہ اس بچّی کو اس طرح کا کوئی وہم نہ تھا۔ اس وقت پہلی بار میں نے اسے چھونے کی ہمت کی۔ میں دھیرے دھیرے اس کے رخساروں کو چھونے لگا جو آنسو بہنے کے بعد کچھ اس طرح گرم ہو گئے تھے جس طرح بارش کے بعد گھاس کی پتّیاں گرم ہو جاتی ہیں۔

دوسرے ٹیوب اسٹیشن آنے تک وہ آرام سے سوتی رہی۔

اس رات بارش شروع ہوئی تو مسلسل ایک ہفتے تک ہوتی رہی۔ گرمیوں کی آمد کے دن ختم ہو چکے تھے۔ سارے شہر پر میلی دُھند کی پرتیں جمع رہتیں۔ سڑک پر چلتے وقت کچھ بھی نظر نہ آتا، نہ پیڑ، نہ لیمپ پوسٹ نہ آدمی۔

مجھے وہ دن یاد ہیں کیونکہ انھیں دنوں مجھے نوکری ملی تھی۔ لندن میں وہ میری پہلی نوکری تھی۔ کام زیادہ ضرور تھا لیکن مشکل نہیں تھا۔ ایک پب میں کاؤنٹر کے پیچھے سات گھنٹے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ بیئر اور شراب کے گلاس دھونا پڑتے تھے۔ رات کے گیارہ بجتے ہی گھنٹی بجانا پڑتی تھی اور بلانوشوں کو اٹھا کر پب کے باہر لے جانا پڑتا تھا۔ کچھ دن تک میں کہیں نکل نہیں سکا۔ گھر لوٹتے ہی بستر پر دراز ہو جاتا جیسے پچھلے مہینوں کی نیند مجھ سے کوئی پرانا انتقام لے رہی ہو۔ آنکھ

کھلتی تو پانی کی بوندیں گرتی ہوئی نظر آتیں جو گھڑی کی ٹِک ٹِک کی طرح برابر گرتی رہتیں۔ کبھی کبھی وہم ہونے لگتا کہ میں مر گیا ہوں اور اپنی قبر کے اندر سے بوندوں کی ٹپ ٹپ سُن رہا ہوں۔

لیکن ایک روز آسمان دکھائی دیا۔ پورا آسمان نہیں صرف نیلی سی ایک قاش اور اسے دیکھ کر اچانک مجھے پارک میں گزارے ہوئے دن یاد آ گئے۔ وہ یہودی ریستوراں کی بلّی اور وہ بازار جاتی ہوئی مسز ٹامس۔ وہ میری چھٹّی کا دن تھا۔ اس دن میں نے اپنے سب سے عمدہ کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ لائبریری کھلی تھی اور سب پرانی صورتیں وہاں موجود تھیں۔ پارک خالی پڑا تھا۔ درختوں پر پچھلے دنوں کی بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔ یہ درخت کچھ سکڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ شاید آنے والی سردیوں کا پتہ انہیں چل گیا تھا۔

میں دوپہر تک پارک میں گریتا کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ نہ بنچ پر نہ پیڑوں کے نیچے۔ دھیرے دھیرے زرد خزانی اُجالا پھیکا پڑنے لگا۔ پانچ بجے ہسپتال کا گجر سنائی دیا اور میری آنکھیں یکایک پھاٹک کی طرف اٹھ گئیں۔

کچھ دیر تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ پھاٹک پر لوہے کا ہینڈل شام کی جاتی ہوئی دھوپ میں چمک رہا تھا اور اس کے پیچھے ہسپتال کی لال اینٹوں والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ گھر جانے کے لیے ان دونوں کو پارک کے بیچ سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر بھی بے یقینی کے عالم میں کبھی پھاٹک کی طرف دیکھ لیتا تھا کبھی سڑک کی طرف۔ پھر یہ خیال بھی آتا کہ آج شاید ہسپتال میں ان کی ڈیوٹی نہ ہو اور وہ دونوں گھر پر ہی موجود ہوں۔

سڑک پر قمقمے روشن ہونے لگے۔ مجھے عجیب سی وحشت ہوئی جیسے انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہوں اور میں انہیں ٹالتا جا رہا ہوں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہو کر انتظار کرنا زیادہ آسان معلوم ہوا اور جیسے ہی میں کھڑا ہوا عین اسی وقت مجھے پھاٹک کے قریب آہٹ سی محسوس ہوئی۔ مجھے سفید پوشاک پہلے نظر آئی اور مسز پارکر کا چہرہ بعد میں۔ وہ پارک کے بیچ والے راستے پر تیز تیز قدموں سے چل رہی تھیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھیں اور اگر وہ میری ہی طرف آ رہی ہوتیں تب بھی شاید دھندلکے میں مجھے نہ پہچان پاتیں۔

میں تیزی سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"مسز پارکر!!؟" پہلی بار میں نے انہیں ان کے نام سے پکارا تھا۔

وہ رک گئیں اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں "آپ یہاں؟" ابھی بھی وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھیں۔

"میں یہاں دوپہرے بیٹھا ہوں"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بھونچکا سی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس پہچان کا مطلب نہ نکال پا رہی ہوں۔ میں مخمصے میں پڑ گیا پھر نرمی سے پوچھا "آج آپ اتنی دیر سے کیوں لوٹ رہی ہیں۔ پانچ کا گجر تو کب کا بج چکا ہے؟"

"پانچ کا گجر؟"

"آپ ہمیشہ پانچ بجے لوٹتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"اوہ!" انھیں یاد آیا۔ جیسے میں تاریخ میں گزرے ہوئے کسی واقعے کا ذکر کر رہا ہوں۔

"آپ لندن میں ہی تھے" انھوں نے پوچھا۔

"مجھے کام مل گیا ہے اسی لیے اتنے دنوں تک نہیں آسکا۔ گریتا کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہچکچائیں۔ پل بھر کا تذبذب جس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ لیکن شام کے دھندلکے میں مجھے وہ بدشگونی سی معلوم ہوئی۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی تھی مگر مجھے آپ کا گھر نہیں معلوم تھا..."

"وہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے" انھوں نے فوراً کہا "لیکن اب یہاں نہیں ہے"

"کچھ دن پہلے اس کے باپ آئے تھے، وہ اسے لے گئے"

میں انھیں دیکھتا رہا۔ میرے اندر جو کچھ تھا وہ ٹھہر گیا۔ میں اس ٹھہراؤ کے اندر تھا اور وہاں سے باہر کی دنیا بالکل صاف دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اس دنیا کو اتنا صاف پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کب کی بات ہے"

زندگی یہاں اور وہاں

اور تب فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی ہے۔ بھاگتا ہوا میز کے پاس آیا ”ہیلو!!“ اس نے کہا ”میں ہوں“ دوسری طرف خاموشی رہی۔ ”ہیلو!!! ...“ جیسے وہ اس کی ڈری سہمی آواز سن رہی ہو ”ہیلو... ہیلو... !!!“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ”کون ہیں... آپ کون ہیں؟...“

اس نے فون پر نگاہ ڈالی۔ خالی دیوار۔ جنوری کا مہینہ، ایک کھڑکی جس کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ ”میں دس تک گنتی گنوں گا“۔ اس نے سوچا اور اس درمیان کچھ نہیں بولوں گا۔ وہ فون رکھ دے گی اور خطرہ ٹل جائے گا۔ ہوا بھی یہی... دوسری طرف سناٹا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ فون کے سیاہ سناٹے کا راز لیتی ہوئی ”فیٹی تم سن رہے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ یہ تم کیا بڑبڑا رہے ہو۔ مجھے سنائی نہیں دے رہا ہے“۔

”میں گنتی گن رہا تھا“۔ اس نے کھسیانی سی آواز میں کہا ”کیا کہا؟ گنتی؟“ وہ دھیرے سے ہنسی۔ ایک مجہول سی مسکراہٹ۔ جو فون کے اندر ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح گردش کر رہی تھی۔ ”سنو آج میں تمہارے گھر نہیں آسکوں گی... لائبریری میں ہی رہوں گی“۔ اس نے کہا ”کیا تم وہاں آسکتے ہو؟“ جی میں آیا کہہ دوں کہ آج مجھے کام ہے۔ مگر وہ میرا جھوٹ پکڑ لے گی۔ گھر میں اکیلے رہنا بھی کوئی کام ہے؟ وہ یقین نہیں کرے گی۔ سوچے گی میں پھر اسے ستا رہا ہوں۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ جب آپ لوگوں سے کہیں کہ آپ اکیلے رہنا چاہتے ہیں تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ گھر میں اکیلے رہتے ہیں، وہ کبھی آپ کا یقین نہیں کرتے۔ اگر آپ خالی ہوں تو خالی کیسے رہ سکتے ہیں؟

قطعی اور آخری شکل میں پکڑ لیا جانا چاہتا تھا...

"اِٹ اِز کلوزنگ ٹائم ..."

اس بار چوکیدار نے بہت قریب آکر کہا اور میری طرف تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا کہ میں وہی آدمی ہوں جو ابھی کچھ دیر پہلے بنچ پر بیٹھا تھا۔

اس بار میں نہیں مڑا۔ پارک سے باہر آکر ہی سانس لی۔ میرا گلا سوکھ گیا تھا اور سینہ کھوکھلا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے سامنے پب کی لالٹین جھولتی دکھائی دی۔ میں نے پیسے گننے کے لیے جیب سے پرس نکالا۔ مفلسی کے دنوں کی یہ عادت مجھ میں اب بھی موجود تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میرے پاس پورے دو پاؤنڈ تھے ــــ مجھے یاد آیا کہ میں انھیں کبوتروں کے دانے کے لیے لایا تھا۔

”جس دن آپ اس کے ساتھ ٹریفلگر اسکوائر گئے تھے اس کے دوسرے ہی دن وہ آئے تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انھیں وہاں کام مل گیا ہے۔“

”اور آپ؟ آپ یہاں اکیلی رہیں گی؟“

میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ انھوں نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ ان کی آواز میں کپکپی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ان کے چہرے پر بچّی کی تصویر دکھائی دی۔ اوپر اُٹھا ہوا ہونٹ، بھیگی آنکھیں۔ ہوا میں اڑتے ہوئے کبوتروں کو دیکھتی ہوئی۔

”آپ کبھی گھر آئیں۔“

انھوں نے رخصت کی اجازت مانگی اور میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں انھیں بہت دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر کافی دیر تک وہیں بنچ پر بیٹھا رہا۔ مجھے کہیں نہیں جانا تھا نہ ہی کسی کا انتظار کرنا تھا۔ دھیرے دھیرے درختوں پر تارے نکلنے لگے۔ میں نے پہلی بار لندن کے آسمان پر اتنے ستارے دیکھے تھے۔ صاف اور چمکتے ہوئے۔ جیسے بارش نے انھیں بھی دھو ڈالا ہو۔

”اِٹ اِز ٹائم ڈیر“

پارک کے چوکیدار نے دور ہی سے آواز لگائی۔ وہ پارک کے داخلی دروازے کی کُنجیاں کھنکھناتا ہوا پارک کے چکّر لگا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ ہر بنچ، جھاڑی اور پیڑ کے نیچے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں کوئی رہ تو نہیں گیا۔ کوئی کھویا ہوا بچّہ، کوئی شرابی یا کوئی پالتو بلّی۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی چیز نہیں چھوٹی تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ہوا چلنے لگی۔ اندھیرے میں ایک جھونکا سا آیا اور پیڑوں کی پتّیاں سرسرانے لگیں۔ تب مجھے دھیمی سی ایک آواز سنائی دی۔ شوخ لہجے میں تنبیہہ کرتی ہوئی۔

”اُسٹاپ... اسٹاپ...“ میرے پاؤں بیچ پارک میں ٹھٹھک گئے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا کوئی نہیں تھا۔ نہ کوئی آواز نہ کھٹکا — صرف درختوں کی شاخیں ہوا میں مل رہی تھیں۔ اس وقت ایک پاگل، عریاں سی خواہش میرے اندر جاگنے لگی کہ یہیں بیٹھ جاؤں۔ ان درختوں کے درمیان جہاں میں پہلی بار پکڑا گیا تھا۔ اور آگے جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ اس بار میں

کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے فون کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ جیسے یہ اس کا چھوٹا سا سر ہو۔ شانوں پر گرتے بال، ماتھے پر سیاہ ٹیکہ، دو بھچکتی سی آنکھیں۔ نہیں نہیں میں خالی ہوں۔ میں آؤں گا۔ کناٹ پلیس میں ایک کام بھی ہے۔ اسے نمٹا کر سیدھا چلا آؤں گا۔ کیا کہا؟ زرا زور سے بولو، مجھے کچھ نہیں سنائی دے رہا ہے“

”میں دن بھر لائبریری میں رہوں گی۔“ اس کی آواز اچانک بہت دھیمی پڑ گئی جیسے گردش کرتی ہوئی چڑیا بہت تھک گئی ہو اور نڈھال ہو کر پڑ رہی ہو۔ ”تم کسی بھی وقت آ سکتے ہو، مجھے...“ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹھکی۔ ”مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ مجھے...“ اب کے وہ خاموش ہو گئی۔ وہ فون کے سنّاٹے پر پھیلا ہوا اس کی آواز کا زرد رنگ دیکھ سکتا تھا — ڈوبتا ہوا — اپنی گونج کی تصویر دیوار پر کھینچتا ہوا...

”کیا تم اب بھی وہاں ہو؟“

پتہ نہیں وہ کیا سوچتی ہو گی وہ پوچھتی نہیں تھی، دیکھتی بھی نہیں تھی بس بیچ کا راستہ نکال لیتی تھی۔ دیکھنے اور پوچھنے کے درمیان۔ جسے وہ ”جاننا“ کہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ بھول جاتی اور سوچتی کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ اچانک لال بتی جل جاتی اور وہ ٹھٹھک جاتی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو وہ کہیں دکھائی نہ دیتا اور بعد میں جب وہ اس سے ملتی تو یہ پوچھنے کی بھی جرأت نہ کر پاتی کہ وہ کہاں تھا۔

وہ دوسرے دن (پھر) فون کرتی۔ وہ گھر ہی میں ہوتا۔ اس کا گھر میں رہنا یقینی بات تھی۔ ایک ٹھوس حقیقت۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی کہ وہ فون کرے اور وہ گھر میں نہ ہو۔ وہ ہمیشہ کناٹ پلیس کی ایک تنگ گلی کے بوتھ سے فون کرتی تھی۔ اُس کے ڈائل گھماتے ہی گھنٹی بجنے لگتی۔ وہ بوتھ کے شیشے کے باہر دیکھنے لگتی۔ اگست کی بھیگی روشنی، کناٹ پلیس کے درخت، لان پر بیٹھے ہوئے لوگ ... وہ سیڑھیاں اتر رہا ہوگا۔ اتنا بڑا اکیلا گھر۔ خالی کمرے۔ فون کی گھنٹی جیسے کسی اُجاڑ گرجا گھر میں دعا کر رہی ہو اور پتھّروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئی ہو۔ بارش کے دنوں میں بوتھ کے شیشوں پر پانی کے قطرے سے بن جاتے۔ دھندھلے دھندھلے بادل چھتوں پر اڑتے رہتے۔ دلّی ایک ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آتی۔ دھند پر تیرتا ہوا ”ہیلو

"... ہیلو" میں ہوں - اور تم ... ؟

"میں یہاں ہوں"

"یہاں اپنے کمرے میں - یہاں جون کی شامیں بری نہیں ہوتیں ... آسمان سے گرد جھڑتی رہتی ہے اور سورج الگ تھلگ کونے میں سلگتا رہتا ہے - وہ لائبریری کے ایک کونے میں بیٹھی رہتی اور وہ — اپنے چھت والے کمرے میں - اب کوئی فون نہیں آئے گا - وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا اور اندھیرا کر لیتا - اور پنکھے کی ہوا میں اس کی ساری تکلیف پسینے کے ساتھ خشک ہو جاتی -

اب کوئی نہیں آئے گا... وہ جا چکی ہے؟ اس نے اسے جاتے دیکھا ہے - وہ مہینے کو الٹا گننے لگتا ہے اور جنوری پر آ کر رک جاتا ہے - ہمیشہ ایک ہی مہینے پر جیسے بیگاٹیل کی گولی ادھر ادھر ٹکرا کر بار بار ایک ہی سوراخ میں گھس جاتی ہو - سردیوں کے دن تھے اور وہ باہر اندھیرے میں کھڑا تھا - اس کے کمرے کی بتّی جل رہی تھی - وہ ٹھٹھر رہا تھا - یہ نیند کا وقت نہیں تھا لیکن نیند ہی کی طرح خواب آور تھا - وہ جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا اس کے کمرے کو دیکھ رہا ہے - نیبو کی جھاڑی اور ایک چھوٹا سا لان — خالی اور اُجاڑ - اب وہاں کوئی نہیں رہتا -

یقین نہیں آتا کہ میں وہی آدمی ہوں جو چار مہینے پہلے تھا - میں اس کے گھر کے باہر اندھیرے میں کھڑا تھا - فیلٹی! تم وہی ہو - سچ تم وہی ہو، بالکل نہیں بدلے میں (ہی) وہی شخص ہوں جو پینتیس سال پہلے اس دنیا میں آیا تھا - اگر وہ زندہ ہوتے تو فوراً مجھے پہچان لیتے - اگر برسوں بعد بھی آپ گھر لوٹ کر آئیں تب بھی وہ فوراً پہچان لیتے تھے - لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آپ کہاں سے لوٹ کر آئے ہیں - وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ اتنی تکلیف سہہ کر انھوں نے جسے پیدا کیا وہ بڑا ہو کر اتنی مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے - اس لیے وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں - اپنے بچوں سے پہلے ہی اُٹھ جاتے ہیں ... ختم ہو جاتے ہیں ... مر جاتے ہیں -

اور بچے؟ انھیں کوئی جلدی نہیں - ایک خالی مکان اور نہ ختم ہونے والا وقت - میں انھیں میں سے ہوں - میں بچا رہ گیا ہوں - مجھے کوئی جلدی نہیں -

شروع میں ایسا نہیں تھا - وہ ہمیشہ عجلت میں رہتا تھا - جب وہ اکیلا ہوتا تب بھی محسوس ہوتا

جیسے کوئی اس کے ساتھ ہے۔ ایک کتّے کی طرح اس کے پیچھے گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے اچانک وہ کبھی بیچ سڑک پر کھڑا ہو جاتا جیسے اس نے کسی کو دیکھ لیا ہو۔ پیڑ کے نیچے کوئی عجیب الہیئت سا کیڑا، دھوپ میں نہاتی ہوئی کوئی تتلی، پیانو سے نکلتی ہوئی کوئی دُھن، جسے سن کر وہ بنگلے کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور مسکرانے لگتا اور تب مجھے ایک عجیب سا وہم ہونے لگتا کہ (شاید) وہ ان اکیلے لوگوں میں سے ہے جو اکیلا ہونے پر بھی ساری دنیا کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے شدید خواہش ہوتی کہ ایک بار میں دیوار پر چڑھ کر اس کے اکیلے پن میں جھانک کر دیکھ سکوں... وہ کس سے بولتا ہے، کہاں جاتا ہے اور کیوں اچانک مسکرانے لگتا ہے۔

لیکن میں لائبریری میں بیٹھی رہتی اور اسے دور سے دیکھا کرتی۔ جب کبھی میں لکھتے لکھتے تھک جاتی تو میز پر اپنا ماتھا ٹکا دیتی۔ اپنی تھیسس کو بھول جاتی اور ان دنوں کے بارے میں سوچنے لگتی جب میں شہر میں گھوما کرتی تھی۔ دِلّی بڑا شہر تھا لیکن کچھ ایسی جگہیں بھی تھیں جہاں ایک دو چہرے بار بار دکھائی دے جاتے تھے۔ میں گھر سے باہر نکلتی اسی طرح جس طرح کچھ لوگ جوا کھیلنے نکلتے ہیں یا ریس کورس چلے جاتے ہیں۔ کیا ان کے ہاتھ میں صحیح پتّا آتا ہے؟ کیا انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سا گھوڑا سب سے آگے نکلے گا۔ میں خود سے کھیلنے لگتی ... کیا وہ اس کنسرٹ میں آئے گا۔ مجھے وہم گزرتا کہ اتوار کے دن نیشنل میوزیم کے ہال میں وہ بھی کہیں پیچھے کھڑا ہے اور ساتویں صدی کے کسی مجسمے کو دیکھ رہا ہے۔ وہ اچانک کسی بھیڑ سے باہر آتے ہوئے دکھائی دے جاتا یا جاڑے کی راتوں میں دیر تک چلنے والی کسی موسیقی کی بزم میں نظر آجاتا۔ اور تب میری مراد پوری ہو جاتی اور میں ٹیکسی کی تلاش میں ایک طرف کھڑی رہتی اور وہ سڑک پار والے بس اسٹینڈ کی طرف، جہاں اسکوٹر کھڑے رہتے ہیں، جاتا ہوا نظر آجاتا۔

دلّی بھی عجیب شہر ہے۔ یہاں کچھ ایسے مقام ہیں جہاں ایک رواں انجمن کے اراکین ہمیشہ نظر آجاتے ہیں گو وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ وہ اندھیرے ہال میں ایک ساتھ تالیاں بجاتے ہیں، ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگاتے، بس

تماشہ ختم ہوتے ہی اپنے اپنے گوشوں میں چلے جاتے ہیں۔

پھر گرمیاں آئیں اور لوگ دوسرے شہروں کی طرف جانے لگے۔ مسوری، نینی تال، شملہ، بالکل ان موسمی پرندوں کی طرح جو موسم بدل جانے پر اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ دِلّی کی سڑکوں پر بھیڑ اب بھی نظر آتی تھی لیکن وہ لوگ جنھیں ہم جانتے تھے اب کہیں نہیں دکھائی دیتے تھے۔ کھیل گھر بند ہو جاتے۔ میوزیم کی راہ داریاں ویران نظر آتیں۔ یوں لگتا جیسے باہر کا وقت بھی اندر کے اونگھتے ہوئے مجسموں کی نیند میں شامل ہو گیا ہو۔

ایک روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں لائبریری میں پیچھے کی نشست پر بیٹھی تھی جہاں روشندان سے آتی ہوئی روشنی سیدھی میز پر پڑتی تھی۔ ایک چڑیا روشن دان کے شیشے پر تنکے جمع کر رہی تھی اور اس کی پرچھائیں ٹھیک میرے ان کاغذوں پر پڑ رہی تھی جن پر میں اپنے نوٹس لکھ رہی تھی۔ مجھے اس منظر کی تفصیل اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کوئی میرے اور اس چڑیا کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا ہو اور اس چڑیا کو اپنی آڑ میں چھپا لیا ہو۔ جب میں نے سر اٹھایا تو وہ نظر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اسے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔

وہ ساکت کھڑا رہا جیسے وہ غلط راستے پر ہو اور واپس مڑنا چاہتا ہو... کیا میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں؟ میں نے نفی میں سر ہلایا اور جلدی سے کاغذ سمیٹ لیے۔ جیسے میں انھیں اس کی آنکھوں سے بچانا چاہ رہی ہوں۔ لیکن اس کی آنکھیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور ان میں دور کہیں غمگساری کا سایہ نظر آتا تھا۔ میں مسکرانے لگی۔ "کیا کچھ کام ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک مڑا تڑا کاغذ میرے نوٹس کے رجسٹر پر رکھ دیا۔ میں نے اس کاغذ کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ کوئی بیان، کوئی استغاثہ یا کوئی 'کھلا خط' جیسی چیز ہے۔ ایسی چیزیں ان دنوں بہت نکلا کرتی تھیں۔ میں اس کاغذ کو توجہ سے پڑھنے لگی۔ لیکن میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ وہ اب بھی کھڑا تھا "مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ نہیں،" اس نے کہا۔ "اگر آپ اس سے متفق ہیں تو دستخط کر دیجیے۔" "اس کا فائدہ؟" میں نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا تاکہ وہ پوری کھل سکے۔ "کیوں نہیں" اس نے کہا "بشرطیکہ ہم انھیں

ناانصافی کا احساس دلا سکیں..." کوئی اور یہ بات کہتا تو مجھے ہنسی آجاتی۔ وہ لائبریری کے نیم اندھیرے میں چپ کھڑا تھا اور باہر جون کی تپتی ہوئی شام تھی جس میں ہوا کا بنس تک نہ تھا۔ ایسے وقت میں حق اور ناانصافی کی بات مجھے ہمالہ کی چوٹی کی طرح معلوم پڑی۔ ٹھنڈی، سفید اور مقدس — ہماری دسترس سے دور۔ کچھ لفظ اچانک بھیڑ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ کھوئے ہوئے لاوارث ٹھہرے پانی میں الگ الگ پتھروں کی طرح سالم، سڈول اور چمکیلے محبت کے، گناہ کے، خدا کے، جھوٹ کے، ناانصافی کے اور موت کے لفظ۔ میں نے جلدی سے کاغذ اٹھایا اور دوسرے ناموں کے نیچے اپنا نام لکھنے لگی اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک عجیب وغریب خیال آیا کہ میں اُس سے پھر ملوں گی۔ کسی اور دن... کیونکہ میرا نام ٹھیک ایک دوسرے کے نام کے نیچے تھا جسے اذیّت کہتے ہیں۔

لیکن یہ بات بہت بعد میں میری سمجھ میں آئی اس دن تک میں نے اسے نہیں سمجھا تھا۔

ان دنوں وہ اکثر ملا کرتے تھے۔ دلّی میں جون کا مہینہ ایک ضیا بار چمک لے کر آتا تھا۔ دھول کے میلے پردے پر سورج ایک شمع کی مانند پگھلتا رہتا اور کوئی بادل ایک پتنگے کی طرح اڑ کر اسے ڈھک لیتا۔ ایک لمحے کے لیے شہر پر اندھیرا چھا جاتا اور ایک سیّال سفیدی لائبریری میں در آتی۔ وہ بڑے ہال میں روشنیاں کر دیتے اور دروازے کھول دیتے اور وہ ٹھنڈی ٹھنڈی میز پر اپنی تھکی ہوئی آنکھیں موند لیتی۔

وہ گھر کی سیڑھیوں سے اترنے لگتا۔ راستے میں بہت سی سڑکیں آتیں لیکن وہ انھیں چھوڑ کر کناٹ پلیس کی تنگ گلی میں مڑ جاتا اور تاریک گلی میں چلتا رہتا۔ باہر دھوپ میں عورتیں پانی سے بھیگی ہوئی تازہ مولیاں کھاتی رہتیں۔ اور ان کے دوسری طرف گل مہر کے پیڑ دھوپ میں دہکتے رہتے۔

دو گلیاروں کے بیچ سڑکیں آتیں اور انھیں پار کرتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی اور اس وقت تک پکڑے رہتی جب تک وہ دونوں تاریک راہ داری میں داخل نہ ہو جاتے۔ پہلی بار انھوں نے ایک دوسرے کو اسی طرح ڈرتے ڈرتے چھوا تھا۔ کبھی راستے پر کبھی سڑک پار کرتے ہوئے۔ لیکن یہ ٹھیک نہ تھا۔ یہ تو ایک طرح کی بدشگونی تھی جس کا سایہ آخر تک

منڈلاتا رہتا ہے اور بعد میں جب ہم تنہا سڑک پار کرتے ہیں تو پرائے لمس کی یاد میں یہ سایہ خلا میں ڈولتا رہتا ہے۔ اس اپاہج کی طرح جسے رہ رہ کر اپنے کٹے ہوئے اعضا کی یاد آتی رہتی ہے۔ یہ بہت معمولی موت ہے لوگ بہت دھیرے دھیرے مرتے ہیں۔

میں ابھی نہیں مروں گا۔ فیٹی نے سوچا۔ میرے باپ ستّر سال کی عمر میں مرے تھے اور ماں ابھی کچھ سال پہلے تک زندہ تھی۔ ہمارے خاندان میں لوگ بڑی لمبی عمر تک دنیا کو بھوگتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی وہ معدوم نہیں ہوتے۔ وہ یہیں رہتے ہیں لیکن کسی کام میں دخل نہیں دیتے۔ بولتے نہیں۔ لیکن جب میری کوئی چیز کھو جاتی ہے اور مجھے اس کا دکھ ہوتا ہے تو وہ اچانک تاریک گوشے سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنی جھولی میں میری کھوئی ہوئی چیز اور میرے دکھ ڈال لیتے ہیں۔ وہ میرے جینے میں نہیں لیکن میری موت میں ضرور شریک ہونا چاہتے ہیں۔ جیسے وہ میرے کانوں میں سرگوشی کر رہے ہوں ... ڈرو نہیں تم بے شک ہمیں بھلا دو مگر ہم تمھیں نہیں بھلا سکتے۔

وہ تاریک راہ داری سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ پھر دھیرے دھیرے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا...

Do you need cheap Air Ticket to Nepal

نیپال؟ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ہنسنے لگا۔ اس کی نگاہ میں کئی ماہ پہلے کا منظر گھوم گیا جب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ "وہ تمھیں غیر ملکی سمجھتے ہیں۔" اس نے کہا "جب تم میرے ساتھ نہیں ہوتی ہو تو نہ تو کوئی مجھ سے ڈالر مانگتا ہے اور نہ کوئی نیپال کا ٹکٹ پیش کرتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ تمھیں میرے ساتھ دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔" "مجھے دیکھ کر؟" وہ حیران ہوتے ہوئے کہتی یا شاید حیران ہونے کی اداکاری کرتی۔ پھر اپنا اسکارف کھول کر بالوں کو سمیٹ لیتی۔ وہ کافی لمبے قد کی لڑکی تھی۔ عینک کے پیچھے اس کی ڈری ڈری آنکھوں سے بے چینی جھانکتی رہتی۔ اس کے کاندھے پر تھیلا لٹکا رہتا اور اس میں ایک نیلی فائل، فل اسکیپ کاغذ اور لائبریری کی کتابیں بھری رہتیں۔ خدا معلوم اس تھیلے میں اور کیا کیا بھرا رہتا تھا۔

"تم نے ٹکٹ لے کیوں نہیں لیا؟" اس نے ہنستے ہوئے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "اتنے کم پیسوں میں نیپال گھوم سکتے ہو۔"

"سنو! ہم اگلی گرمیوں میں وہاں چل سکتے ہیں۔" اس نے فرطِ مسرت سے کہہ ڈالا۔

"اگلی گرمیوں میں؟" اس کی آواز میں خفیف سی حیرت تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی تھیسس تکمیل کے مراحل میں تھی اور اُن دنوں وہ نہ تو سردیوں کے بارے میں سوچتی تھی نہ گرمیوں کے بارے میں۔ بس لائبریری سے گھر اور گھر سے لائبریری۔ یہی اس کا معمول تھا۔ کتنی چھوٹی دنیا تھی اور ساتھ ہی کتنی بڑی بھی۔ نیپال اِن دنیاؤں کے بیچ اسے ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت کناٹ پلیس کے تاریک گلیارے میں چلتے ہوئے اسے عجیب سا سکھ ملا کہ وہ اِس دنیا سے باہر جا سکتی ہے، نکل سکتی ہے۔۔۔

سُکھ؟ کیا کوئی ایسی چیز ہے جس پر اُنگلی رکھ کر کہا جا سکے کہ یہ سُکھ ہے۔ یہ تشفی ہے؟ فیٹی ایک کھمبے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ باہر کناٹ پلیس کا فوّارہ دیوالی کے انار کی طرح لگ رہا تھا۔ چھنتی ہوئی دھوپ میں سفید پھوار اوپر اُٹھ رہی تھی، نیچے گر رہی تھی۔ نہیں سکھ ہوتا کہیں نہیں ہے صرف اپنی تکلیف میں اسے اس وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جب تمہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جون ہے اور وہ جنوری تھا۔ تم نے سوچا تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد تم اس شہر میں نہیں رہو گے لیکن تم زندہ ہو اور سانس لے رہے ہو۔۔۔ آدمی کی کھال کتنی موٹی ہوتی ہے کہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ اس کی کھال پانی میں ڈوب کر ایک کتّے کی طرح باہر آ جاتی ہے جو یکبارگی اپنا جسم جھنجھوڑ کر سب کچھ جھاڑ دیتا ہے۔ پانی کا اندھیرا کتنی دیر یاد رہ سکتا ہے؟

وہ اسٹیٹسمین کی بلڈنگ کے سامنے چلا آیا اور وہاں کھڑے ہو کر اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب لال روشنی ہری روشنی میں تبدیل ہوتی ہے۔ اوپر طوطوں کا ایک غول کرزن روڈ کے درختوں سے اُڑ کر منٹو روڈ کے پُل پر ہوا میں ایک قطار سی بناتا ہوا پرواز کر رہا تھا۔

ایک بار پُل کے اوپر سے ریل گزر رہی تھی اور وہ پُل کے نیچے سے گزرنے والی بس میں بیٹھے تھے۔ "تم نے کچھ مانگا؟" اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھا "اس وقت تم جو کچھ مانگو گے وہ مل جائے گا!"۔۔۔ میں ہنسنے لگا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ان چیزوں میں یقین رکھتی

ہے۔ ”جلدی مانگو نہیں تو ریل گزر جائے گی!!“ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں چپ بیٹھے رہے اور بس پُل سے باہر نکل آئی۔ وہ برسات کی شام تھی اور ایک منجمد سی روشنی اس کے چہرے پر گر رہی تھی۔ ”بولو تم نے کیا مانگا تھا؟ اس نے اداس نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے منہ موڑ لیا اور بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس شام جب منٹو برج کے اوپر سے ریل گزر رہی تھی ان دونوں نے ایک ہی مراد مانگی تھی۔ ایک دوسرے سے الگ ہونے کی وہ جتنا زیادہ ایک دوسرے کو چاہتے تھے اتنا ہی ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے کے لیے بے چین تھے۔ جیسے ایک دوسرے کو چاہنا کوئی گناہ ہو، کوئی بُرا خواب ہو۔ اسی وقت ہری بتی روشن ہوئی اور وہ سڑک پار کرتا ہوا کرزن روڈ کے زرد اور خاک آلود درختوں کے نیچے چلا آیا۔ درختوں کے سائے میں چلتے ہوئے اسے اچانک یاد آیا کہ یسوع مسیح نے کہا تھا کہ جس کے پاس ہے اُسے اور بھی دیا جائے گا اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے، اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو کچھ اُس کے پاس ہے۔

پتہ نہیں اس کا مطلب کیا تھا۔

میں ابھی جاؤں گا اور اس سے یہی پوچھوں گا۔ اور اسی وقت میرے تصور میں دھندلی سی تصویر اُبھر آتی ہے۔ وہ لائبریری کے ایک کونے میں بیٹھی ہوگی۔ اپنے ریسرچ کے کاغذات میں ڈوبی ہوئی۔ وہ سوچ رہی ہوگی کہ اب میں نہیں جاؤں گا۔ وہ دوبارہ فون کرے گی اور گھر میں کوئی نہیں ہوگا۔ گھر کے سونے کمروں میں فون کی گھنٹی بے وجہ بجتی رہے گی کیونکہ میں تو یہاں ہوں کرزن روڈ کے پیڑوں کے نیچے اور اوپر طوطوں کا جھنڈ شام کی دھوپ میں منٹو برج کی طرف جا رہا ہے۔ بائیبل کا صرف ایک جملہ دہراتا ہوا — ”جس کے پاس ہے ... جس کے پاس نہیں ہے۔“

وہ ایک طرح کا کھیل تھا جسے وہ دونوں کھیلتے تھے۔ خاص کر ان دنوں جب وہ بہت تھک جاتی اور لائبریری سے سیدھے اس کے کمرے میں آ کر لیٹ جاتی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے کھول دیتا تھا۔ نیچے کے کمروں میں سنّاٹا رہتا اور وہ بند رہتے۔

صرف چھت کھلی رہتی۔ جون کا اندھیرا چھوٹے ٹکڑوں میں آتا تھا اور ہر ٹکڑے

پر ڈھیر سے تارے بچھے رہتے ۔ وہ دونوں ان تاروں کو دروازے پر اترتا ہوا دیکھتے رہتے ۔

وہ ایک کھیل تھا ۔ ایک طلسم اور شعبدہ — جہاں وہ دونوں ایک لفظ بھی کہے بغیر ایک دوسرے کی خواہش کو بھانپ لیتے تھے ۔ کچھ لوگ اس عمل کو ٹیلی پیتھی کہتے ہیں ۔ وہ دونوں جب کمرے میں آتے تھے تو وہ تھکی اور نڈھال سی اندھیرے میں آنکھیں موند کر لیٹ جاتی تھی ۔

اور وہ ہیٹر پر پانی رکھ دیتا ۔ پھر اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا ۔ دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے کی سانسیں سننے لگتے ۔

”سنو !!“ اس نے سر اٹھا کر کہا ”میں نے کبھی تمھارے باپ کو نہیں دیکھا ۔

”تمھیں شاید معلوم نہیں ، وہ مر گئے ۔“

”مجھے معلوم ہے“ اس نے کہا لیکن تم نے کبھی ان کی تصویر بھی نہیں دکھائی ۔

وہ اٹھ بیٹھتی اور کھیل شروع ہو جاتا ۔ بڑا عجیب سا کھیل تھا کیونکہ کچھ دیر کے لیے ہم ایک دوسرے کو بالکل بھول جاتے اور اُس لمحے سے آزاد ہو کر ایک دوسرے زمانے میں چلے جاتے تھے جہاں میرا گھر دھیرے دھیرے جاگنے لگتا تھا ۔ بند کمروں کے دروازے کھل جاتے جیسے وہ ایک عجائب خانہ ہو اور میں اس کا گائڈ ہوں ۔ وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے ہر چیز کو دیکھنے لگتی ... میں ایک الماری کھولتا پھر دوسری ... پتہ نہیں وہ تصویر کہاں تھی جو تیس سال پہلے لی گئی تھی ۔ ڈھونڈتے وقت دوسری چیزیں نکل آتیں میں انھیں چھپانے کی کوشش کرتا اور وہ میرا ہاتھ ہٹا دیتی ۔ مجھے یاد ہے وہ ماں کی نتھ کو بہت دھیان سے دیکھا کرتی تھی اور میں اس نتھ سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس نتھ نے ماں کی ساری ناک چھیل ڈالی تھی ۔ الماری کے دوسرے کونے میں میرے باپ کے نقلی دانت رکھے تھے میں نے انھیں اسی گلاس میں سنبھال کر رکھا تھا جس میں میرے باپ ان دانتوں کو نکال کر رکھتے تھے ۔ دانتوں کے بیچ اب بھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھنسے تھے جو انھوں نے پچھلی رات ہی کھائے تھے ۔

”مرنے سے ایک رات قبل ؟“ اس نے پوچھا ۔ وہ میرے پیچھے کھڑی تھی ۔ اس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا جیسے وہ مجھے پناہ دینے کی کوشش کر رہی ہو ۔ لیکن میں اس کی پناہ سے باہر

تھا۔ میں برسوں سے اس گھر میں اکیلا رہ رہا تھا اس کے کونے کونے کو جانتا تھا۔

مجھے کسی پناہ کی ضرورت نہیں تھی۔

”یہ پلنگ دیکھ رہی ہو... اور یہ بستر۔“ اُس نے کہا ”وہ یہاں لیٹتے تھے اور میں اوپر سوتا تھا، وہاں اوپر سائبان میں جہاں تم آتی ہو۔“

میں اس کے پیچھے چلتی گئی۔ وہ ایک وسیع ہال تھا جہاں کونے میں ایک تپائی رکھی تھی اور پیچھے کپڑوں کی وارڈروب۔ اس نے کھڑکی کھولی اور اُسی وقت روشنی کا سیلاب یوں اندر چلا آیا جیسے برسوں سے اندر آنے کا منتظر ہو۔ روشنی بستر پر پڑ رہی تھی ایک طرف اٹھا ہوا تکیہ، دو کمبل، بیچ میں ایک گڈھا جیسے کوئی بستر میں لیٹا ہو اور ابھی ابھی باہر گیا ہو۔

”یہ ہے اُن کا بستر؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے کسی بھوت کو دیکھا ہو۔ کونے میں کھڑا مسکراتا ہوا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ میرا باپ سڑک پر اکیلے چلتے ہوئے اسی طرح مسکراتا تھا، جیسے اس نے اندر کی دنیا سے باہر آتے وقت کسی غیر مرئی شے کو دیکھ لیا ہو۔ وہ ٹھٹھک جاتا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔

”فیٹی!“ میں نے اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی شیشے کی دیوار ہوں اور وہ میرے اندر سے گزر کر میرے آر پار دیکھ رہا ہو۔ ”ہاں۔ وہ یہیں مرے تھے۔“ اس نے کہا۔ میں ان کی تپائی پر دوا رکھ دیتا تھا، پیشاب کی بوتل صاف کر دیتا تھا اور سرہانے کی کھڑکی کھول دیتا تھا۔ تم جانتی ہو دلّی میں اگست کی راتیں کتنی صاف ہوتی ہیں۔ سونے سے پہلے وہ آسمان پر ستاروں کی کہکشاں دیکھتے تھے۔ انھیں کبھی نیند کی گولیوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تاروں کے درمیان سفید لکیر پر چلتے ہوئے مجھے نیند آجاتی ہے۔ میری طرف حیرت سے مت دیکھو۔ وہ واقعی عجیب و غریب شخص تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھتا ہوں تو ایک دن انھوں نے مجھے اپنا رجسٹر دکھایا‘ مرنے سے دو دن پہلے Please turn to page 97 انھوں نے کہا۔ وہ اپنے بچّوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ میں نے رجسٹر میں ان کا بتایا ہوا صفحہ کھولا تو وہ پورا کا

پورا سادہ تھا صرف پیشانی پر لکھا تھا Life here and here after۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگے۔ "یہ ٹائیٹل ہے" انھوں نے کہا۔ "جب بیٹھنے کے لائق ہو جاؤں گا تو سب کچھ لکھ ڈالوں گا۔ میں بڑی حد تک انھیں پر پڑا ہوں۔ میری بڑی بہن مجھ سے کہا کرتی تھی کہ میرے اور بابو کے درمیان ایک بہت مہین اور باریک سی ڈوری ہے جو ان کی دنیا کو مجھ سے الگ کر دیتی ہے۔ جس دن میں وہ ڈوری کاٹ دوں گا میں وہیں نظر آؤں گا جہاں وہ ہیں۔ گناہوں اور آلودگیوں سے پاک زمین پر۔

"بٹی! اِدھر دیکھو۔ یہ ہے تصویر۔ اب تم انھیں دیکھ سکتی ہو"

اُدھر نہیں... اِدھر۔ کھڑکی کے پاس آجاؤ۔ روشنی میں دیکھو۔ اس وقت میری عمر کوئی سات برس کی رہی ہوگی۔ تم ہنسوگی لیکن سچ بات یہ ہے کہ میں اس روز دن بھر روتا رہا۔ میں نے سوچا میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ میرا یہ عقیدہ غلط تھا کہ تصویر کھنچواتے ہی میرے اندر کا بھڑنا (یہ ماں کا ہی لفظ تھا جسے شاید وہ روح کے معنی میں استعمال کرتی تھی۔ کبھی کبھی میں غصّے میں کھانا کھانا چھوڑ دیتا تھا تو وہ مجھے ڈراتی تھی کہ جب میں سو جاؤں گا تو میرا بھڑنا میرے جسم سے نکل کر باورچی خانے میں چلا جائے گا اور رات بھر بھوکا پیاسا منڈلاتا رہے گا)۔ مجھے چھوڑ کر تصویر پر چپک جائے گا۔ اسی طرح جس طرح کوئی مردہ تتلی البم کے کاغذ پر چپک جاتی ہے مجھے ڈر تھا کہ میں تصویر میں آتے ہی اس دنیا سے اُٹھ جاؤں گا اس لیے کہ آدمی ایک ہی وقت میں دو جگہوں پر موجود نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس طرح متوحش، بدحواس اور غمگین نگاہوں سے دنیا کو دیکھ رہا ہوں۔ میری ماں کرسی پر بیٹھی ہے اور بابو اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔ میں آگے ہوں نہ پیچھے۔ بلکہ ان دونوں سے الگ اپنا ہاتھ کرسی کے ہتھّے پر ٹکائے ہوئے اپنی دشوار منزل کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ موٹے بچّے یوں بھی کافی غم زدہ نظر آتے ہیں۔ انھیں دنوں کا ملا ہوا نام آج تک چلا آرہا ہے۔ تمھیں یاد ہے جب میں لائبریری میں استغاثہ لے کر آیا تھا تب تم نے سوچا تھا کہ جیسے میں کوئی..."

وہ میری باتیں سننے کے بجائے کھوئی ہوئی آنکھوں سے اُن تین انوکھے انسانوں کو دیکھ رہی تھی جو تیس سال پہلے کی تصویر میں سانس لے رہے تھے۔ اس کی طرف گھور رہے تھے جیسے

پوچھ رہے ہوں کہ یہ اجنبی لڑکی کون ہے جو ان کے گھر میں چلی آئی ہے اور کھڑکی کی روشنی میں ان کے اندھیرے کی تھاہ لے رہی ہے Life here and here after کون سی زندگی یہاں والی یا وہاں والی جہاں وہ ہیں۔ جب میں روشنی کرنے کے لیے اُٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا۔ اسے کمرے میں اندھیرے کا دھیرے دھیرے پھیلنا اچھا لگتا تھا۔ جون کی جاتی ہوئی زرد دھوپ بستر پر بکھر جاتی اور میں اس کے گھٹنوں پر سر ٹکا کر لیٹ جاتا اور سوچنے لگتا پتہ نہیں وہ ــــ بابو اور ماں کے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی۔ جب کسی لڑکی کو بہت چاہا جانے لگتا ہے تو اندر کی پرتیں کھل جاتی ہیں اور ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ نہ پھیل جائے۔ ایک عمر کے بعد وہ (ماں باپ) تمھارے لیے ایک کھلے ہوئے زخم کی طرح ہوتے ہیں اگر وہ زندہ ہیں تو اپنی عزت کی حفاظت خود ہی کر سکتے ہیں اور اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو کوئی بھی ان کی عزّت کو مٹّی میں ملا سکتا ہے۔

”سنو!! اس نے دھیرے سے کہا اور اس کی آواز سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں اس کی آواز کو پہچانتا تھا جب اسے تلخ و تند کہنا ہوتا تھا تو اس کا لہجہ اچانک نرم پڑ جاتا تھا۔

”فیلٹی!“ اس نے کہا ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔ کس طرح؟ کیسے؟“ میں نے کہا۔

”تصویر میں تم بالکل بے گناہ دکھائی دیتے ہو“

اس نے یہی لفظ کہا تھا۔ بے گناہ۔ جسے سن کر مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں غلاظت میں سنا ہوا ہوں۔ تیس سال کے گناہ، جھوٹ اور فریب۔ میں ہنسنے لگا۔

”ارا یہ تصویر تیس سال پہلے کی ہے اس وقت میں سات برس کا تھا“

”مجھے معلوم ہے“ اس نے کہا۔

”تمھیں کچھ نہیں معلوم۔ میرا جسم غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ اس نے میرا سر اپنے گھٹنوں پر سے اس طرح ہٹا دیا جیسے مجھے چھوت کی بیماری ہو۔ جی چاہا کہ اُٹھ کر کمرے میں روشنی کر دوں اور اک بار اس کی آنکھوں سے پھر خود کو دیکھوں۔ لیکن میں اٹھا نہیں۔ اندھیرے میں بیٹھا رہا مجھے شک ہوا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم اندھیرے میں دوسرے کو دیکھ نہیں

پاتے ہیں لیکن یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دوسرا ہمیں دیکھ رہا ہے، تول رہا ہے، پرکھ رہا ہے۔ لیکن ایسے وقت ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح کے دیکھنے سے ہمیں کوئی بھی چیز نہیں بچا سکتی۔

وہ شاید سمجھ گئی۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھایا اور میرا چہرہ ٹٹولنے لگی۔ میں نے اسے بیچ ہی میں پکڑ لیا۔

”سنو!“ اس نے کہا ”کیا تم سچ مچ مجھے چاہتے ہو۔ کیا میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں؟“

وہ اتنا مایوسانہ، اتنا کربناک، اتنا بھرپور سوال تھا کہ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیا جیسے اچانک کسی نے سرِعام مجھ سے پوچھ لیا ہو۔ فیلٹی! کیا تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟ دل میں ایک احمقانہ خیال یہ بھی آتا ہے کہ اگر اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے تو تم زندہ نہیں ہو بلکہ بہت سال پہلے مر چکے ہو۔ اس وقت جب تمھاری تصویر کھینچی گئی تھی، تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارا پھرنا کہیں اور ہے تم نے اسے راستے میں کہاں گرا دیا؟

میں نے اندھیرے میں اُسے پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ ہم دونوں دیر تک ان ڈرے ہوئے بچّوں کی طرح بیٹھے رہے جو راستہ بھول کر فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ شاید کوئی ہاتھ پکڑ کر انھیں گھر تک پہنچا آئے۔

گھر کہیں نہیں تھا۔ دُکھ تھا۔ بانجھ دکھ۔ جس کا کوئی حاصل نہیں۔ جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر ختم ہو جاتا ہے اور ہم کو اس وقت تک نہیں دیکھ پاتے جب تک رشتوں کا آدھا حصّہ پانی میں ڈوب نہیں جاتا۔ اس وقت ہم گھبرا جاتے ہیں۔ دہشت کے عالم میں پانی اُلٹنے لگتے ہیں لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا! جتنا دکھ ہم پانی سے باہر نکالتے ہیں اس سے کہیں زیادہ سوراخ سے اندر چلا آتا ہے۔ اور ہم بار بار وہیں لوٹ آتے ہیں۔ ایک کمرہ، باپ کا گھر، بستر، ماں کی خالی کرسی اور جون کا مہینہ۔ وہ لائبریری میں بیٹھی رہتی اور فیلٹی جھوٹ اور انصاف کے بارے میں بیان تیار کرتا رہتا یا کوئی ایسی چیز جو کسی طرح سوراخ کو بند کر سکے، بہتے ہوئے پانی کو روک سکے۔

پھر جولائی کا مہینہ آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ سکھ کیا ہوتا ہے۔ کبھی دِلّی کا آسمان جولائی

کے مہینے میں دیکھا ہے۔ ٹیلی فون بوتھ کے شیشے کے باہر جب بادلوں کے پیچھے روشنی کا ہلکا سا زرد دھبہ دکھائی دیتا ہے۔ نہیں دکھائی نہیں دیتا صرف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز چمک رہی ہے۔ یہ سورج ہے۔ سورج کا چھوٹا سا روشن ہیولیٰ۔ ہمارا سکھ بالکل ایسا ہی تھا۔ ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا وہم فریب اور حقیقت کے درمیان بھاگتا ہوا ایک سایہ۔ وہ میرے گھر کے اوپر ٹھہر جاتا اور ہم اپنی چٹائی اور چادر باہر لے آتے۔ بارش کی تھوڑی سی بوندیں چھت پر کی دھول کو صاف کر دیتیں اور ایک سوندھا، دودھ کی رنگت کا دھواں ہوا میں پھیلنے لگتا۔ ہم چھت پر اکیلے لیٹے رہتے۔ مجھے اس بات کا بالکل ڈر نہیں تھا کہ کوئی ہمارے سکھ میں خلل ڈالے گا۔ اس لیے کہ ماں باپ تو برسوں پہلے مر چکے تھے اور سارے کمرے، الماریاں اور مکان کی چھت میرے حوالے کر گئے تھے۔

کھانے کی فکر بھی نہیں تھی۔ وہ اپنا ناشتے دان ساتھ لاتی اور اسے میرے ہیٹر پر رکھ دیتی جس میں انڈے کی بھجیا، آلو، ٹوسٹ سبھی کچھ ہوتا۔ اور جب کبھی اس کی ماں بہت خوش ہوتی تو اس میں مٹر پلاؤ بھی رکھ دیتی۔ میرے پاس سوکھی چیزیں ہوتی تھیں۔ ڈبل روٹی، پنیر اور مچھلی کے ڈبے وغیرہ۔ کبھی کبھی تو میں اسے حیرت میں ڈال دیتا جب اس کی آنکھوں پر رومال باندھ کر (کہ وہ اندر نہ دیکھ سکے) اسے زبردستی باہر چھت پر بٹھا دیتا اور پنیر کا آملیٹ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ آملیٹ کھانے لگتی اور حیران ہو کر میری طرف منہ اٹھا دیتی، میں اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دیتا تاکہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ سکے۔

“کس نے سکھایا تم کو ـــ؟” اس نے پوچھا۔ جیسے آملیٹ بنانا دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو

“کسی نے نہیں،” میں نے کہا “جب میں ولایت میں تھا تو سب کچھ خود بناتا تھا۔”

“خود بناتے تھے؟”

“ہاں ... کیوں؟” میں نہیں جانتا تھا کہ اتنی معمولی بات کا اس پر اتنا اثر ہوگا۔

“میں کچھ بھی نہیں بنا سکتی۔” اس نے کہا اور میرے پہلو سے لگ کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کے جسم کا صرف آدھا حصہ دکھائی دے سکتا تھا۔ آدھی پیشانی، پلکوں کے

بال اور کھلے ہوئے ہونٹ۔ جیسے بچے کچھ سوچتے وقت منہ کھول دیتے ہیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر میں باہر جاؤں تو سب کچھ خود کر سکتی ہوں؟“

”باہر کہاں؟

”کہیں بھی۔ اس ملک کے باہر نہیں بلکہ اپنے گھر کے باہر۔“

”کیا اپنا گھر چھوڑ دو گی؟ میں نے دھیرے سے اس کا سر اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا جو میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اچانک اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ بڑا نازک وقت ہوتا تھا جب وہ اپنے خول میں سمٹ جاتی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہ چل پاتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے اس کا دل تو میرے پاس ہو لیکن خود وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ بالکل ان جانوروں کی طرح جو خطرے کی آہٹ پاتے ہی اپنا رنگ بدل لیتے ہیں اور پیڑ پودوں میں موجود ہوتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے۔

”ارا!!“ میں اسے ٹھوکا دیتا اور وہ اپنے خول سے باہر نکل آتی۔ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگتی گویا سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اس وقت کہاں ہے۔ اپنے گھر میں یا میرے کمرے کی چھت پر...

وہ کمرے کے اندر جاتی لیکن روشنی نہ کرتی۔ کمرے میں ایک مہین سی خاک رنگ روشنی رینگتی رہتی ۔۔ جولائی کی روشنی جو ستاروں سے چھنتی ہوئی اندر تک پھیل جاتی ہے۔ باہر سے میں اُسے دیکھتا۔ اس کا سر ایک خواب ناک سا دائرہ معلوم ہوتا۔

مونہہ میں دبے کلپ، کرسی پر کتابوں کے بیچ اس کی جینس، کرتا، تھیلا اور تھیلے میں رکھی نیلی فائل، جس کے کاغذ باہر نکلے رہتے۔ اب لگتا ہے کہ جولائی کی ایک شام کو جو کچھ دیکھا تھا وہ غلط تھا۔ دھوکا... کیونکہ جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو سب شامیں ایک یاد بن جاتی ہیں اور ہمیں وہم ہوتا ہے کہ وہ سب جولائی کی ایک شام کو ہوا تھا جب کہ اس میں اگست، ستمبر اور اکتوبر کے بھی سارے لمحے شامل ہوتے ہیں۔ بالکل ایک پرانے Fossil کی طرح جو اوپر سے صرف ایک پتھر سا نظر آتا ہے لیکن جس میں گزری ہوئی صدیوں کی تمام ہڈیاں پرت در پرت جمع ہوتی رہتی ہیں۔

وہ روشنی کر دیتی اور دروازے سے باہر جھانکنے لگتی۔

فیٹی! وہ پکارتی اور میں چپ رہتا اور چھت کے تاریک گوشے میں خاموش پڑا رہتا۔

فیٹی!! وہ دوبارہ بلاتی اور کوئی جواب نہ پا کر باہر آ جاتی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی اور پھر پانی کی ٹنکی کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ نل کی ٹونٹی کھول دیتی اور اپنے کرتے کی آستینوں کو الٹ کر منہ دھونے لگتی۔ میں دیکھتا کہ کس طرح پانی اس کے چہرے پر بہتا ہوا اس کی ناک کی نوک پر ایک چمکتے ہوئے قطرے کی صورت میں ٹھہر جاتا۔ گویا وہ کوئی رُکا ہوا آنسو ہو... میں اس کے قریب پہنچ جاتا اور وہ چونک کر پلٹ پڑتی۔ میرے تپتے ہوئے ہونٹ اس کے بھیگے ہوئے چہرے کی ٹھنڈک کو جذب کرنے لگتے... دکھ میں کوئی ڈر نہیں ہوتا لیکن جسے ہم سکھ کہتے ہیں وہ ہمیشہ خطروں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے جانے کا وقت ہوتا تو ہم دونوں کو یوں لگتا جیسے کوئی ہمیں ٹکڑوں میں بانٹ رہا ہو، تار تار کر رہا ہو۔ حالانکہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ میں تالا چابی ڈھونڈنے لگتا اور وہ ناشتے دان کا خالی ڈبّہ اپنے اس جھولے میں ڈال دیتی جس میں اس کے کاغذات بے ترتیبی سے پڑے رہتے۔

”فیٹی!“ اس نے کہا۔ ”تم بیٹھے رہو میں چلی جاؤں گی۔ ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔“

”معلوم ہے کیا بجا ہے؟ میں ایک ہاتھ میں اس کا تھیلا سنبھالتا اور دوسرے ہاتھ سے ٹارچ جلا کر زینے سے اترنے لگتا۔ دیوار پر اس کا باریک سایہ میرا تعاقب کرتا۔ اترتے وقت آدھے راستے پر وہ ٹھٹھک جاتی۔ سارا گھر خالی! وہ اس گھر کے کونے کونے سے واقف تھی۔ میں نے اسے سب کچھ دکھا دیا تھا۔ وہ کمرہ جہاں بڑی بہن شادی سے پہلے رہتی تھی، داہنی طرف کا وہ کمرہ جہاں بابو کا انتقال ہوا تھا، پیچھے والی کھڑکی جہاں سے ستاروں کی کہکشاں دکھائی دیتی تھی... اور پرانی اور بوسیدہ سی ایک آرام کرسی۔

وہ سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ سفید اور مبہوت برآمدے کی روشنی اس کے بالوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ باہر جاتے وقت ہمیشہ اس کرسی کو دیکھا کرتی تھی جو چھجّے کے بالکل بیچ

میں پڑی رہتی تھی۔ ”تمھیں یاد ہے؟“ وہ دھیمی آواز میں پوچھتی ”ہاں“ میں کہتا۔ ”میں یہیں کھڑا تھا۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھی تھیں۔“

”ان کے آخری الفاظ کیا تھے؟“

”کون سے آخری الفاظ؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”جب تم ولایت جارہے تھے تو انھوں نے کیا کہا تھا“ اس نے پوچھا۔

”تمھیں کئی بار بتا چکا ہوں“ میں نے کہا۔

”میں دوبارہ سننا چاہتی ہوں۔ تم باہر جارہے تھے اور وہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تمھیں باہر جاتے دیکھ رہی تھیں...“ اس نے کہا۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

”انھوں نے ٹکٹ کے بارے میں پوچھا تھا کہ میں نے اسے جیب میں رکھا ہے یا پرس میں“ میں نے کہا۔ ”انھیں ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ میں اپنا ٹکٹ کھو دوں گا۔“ لمحہ بھر وہ خالی کرسی کو دیکھتی رہی۔

”اور تم نے انھیں کھو دیا۔“

”وہ بہت بوڑھی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”انھیں کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

”فیٹی!“... اس کی آواز میں تھرتھری تھی ”ان کی موت اکیلے گھر میں ہوئی تھی؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلی تھیں... میرے سامنے ایک آئینہ ہے — لمبے درختوں سے گھری وکٹوریہ اسٹریٹ اور بیچ میں ایک چھوٹا سا پارک، پارک میں کھیلتے ہوئے بچے اور اوپر اڑتے ہوئے بادل۔ لندن کا زرد اجالا... اور ہاتھ میں ایک کیبل لیے بنچ پر بیٹھا ہوا میں۔ سرخ کاغذ کا ایک ٹکڑا جس سے پانچ سیاہ لفظ جھانک رہے ہیں 'Mother died without any pain: میں ان لفظوں کو بار بار دہرا رہا ہوں۔ without any pain, without pain اس تبتی فقیر کی طرح جو دعا کی چرخی گھماتا ہوا ایک ایسے دانے پر پہنچ جاتا ہے جہاں سچ ہے، خدا ہے، ایک بھیانک سناٹا۔ ایک طلسم خانہ 'Wonder Land' جس کے اندر ایلس نے جھانکا ہوگا، دیکھا ہوگا کہ کوئی دروازہ دوسری دنیا کو جاتا ہے...

”اکیلے ہیں! ہاں اکیلے ہیں“۔ میں نے کہا ”مگر بغیر کسی تکلیف کے Without any pain انھیں آخری وقت کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ارا۔ ان کے آخری دن تنہائی میں گزرے لیکن سکھ میں گزرے۔ یہ بتاتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ رو رہی ہے، تھر تھر کانپ رہی ہے۔ میں اسے چھونے کے لیے آگے بڑھتا اور وہ مجھے پیچھے ڈھکیل دیتی اور دیوار سے لگ کر مجبور نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتی۔ ایک عجیب سی نفرت سے۔ ایسی نفرت جس میں ایک شدید حقارت اور سفاک چھپی رہتی ہے۔ ”تم یہاں کیوں رہ رہے ہو فیٹی“ ”یہ گھر بیچ کیوں نہیں دیتے۔ وہ کہتی ”یہ تمھارے باپ کا گھر ہے اور تم اس سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہو“ وہ دھیرے دھیرے اس زخم کو چھیڑنے لگتی جس میں سے رہ رہ کر ٹیس اُٹھنے لگتی ہے۔ وہ زخم کریدتی رہتی ”جاتے کیوں نہیں۔ نہیں جاتے اس لیے کہ تم یہاں محفوظ ہو“۔ وہ روتے روتے ہنسنے لگتی۔ مجھے چمکارنے لگتی۔ فیٹی ڈیر۔ ڈیر فیٹی۔ اور میں ان باتوں کی تاب نہ لا پاتا۔ میں اس کے سامنے اس ادھ موئے جانور کی طرح ہو جاتا جس کا ڈھڑ کچل دیا جاتا ہے اور دُم تڑپتی رہتی ہے۔ اس کا دُکھ گھر کے کسی کونے میں غائب ہو جاتا اور وہ الماری میں رکھی ہوئی چیزوں کے پیچھے جاکر چھپ جاتا۔ بابو کے دانت، ماں کی نتھ، شاعری کے مجموعے ”اسٹیٹمنٹ“، ریکارڈ۔ اپنے کو بچانے کے لیے اس نے کتنی چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ لیکن وہ اسے ان چیزوں کے پیچھے سے باہر نکال لاتی جس طرح ہم کسی چھپکلی یا کسی چھچھوندر کو دوڑا دوڑا کر اور پیر پٹک پٹک کر تاریک اور محفوظ کونوں سے نکال کر اس دنیا کے بے رحم اجالے میں لے آتے ہیں۔

وہ باہر نکل آتی۔ باہر جہاں مکانوں کی چھتوں پر جولائی کی راتوں کی سیاہی پھیلی رہتی۔ وہ آٹو رکشا میں بیٹھتی اور اس کے گھر سے دور بھاگنے لگتی۔ کناٹ پلیس، انڈیا گیٹ، پرانا قلعہ ایک ایک کر کے سب گزر جاتے۔ آسمان پر صرف بادل نظر آتے یا چھٹکے ہوئے تارے جو جولائی کی راتوں میں دُھلے ہوئے بٹنوں کی طرح چمکتے تھے۔ نہ ریل گاڑی نہ کوئی پُل جس کے نیچے سے گزرتے ہوئے وہ کوئی مراد مانگ سکتی۔

اس نے چابی باہر نکالی، دروازے کا تالا کھولا اور اندر چلی آئی۔ چھوٹا سا لان،

نیبو کے پیڑ اور اینٹوں کی دیوار۔ یہ تھا اس کا گھر۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ پاپا ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں گے۔ ماں کپڑوں پر استری کر رہی ہوں گی۔ دونوں سمجھ جاتے کہ وہ آگئی ہے لیکن اس کے کمرے میں آنے کی ان کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ باورچی خانے میں جا کر ناشتے دان رکھتی، منہ دھوتی اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ پھر کوئی ریکارڈ لگا دیتی اور کپڑے تبدیل کیے بغیر اپنے بستر پر دراز ہو جاتی۔ وقت گزرتا جاتا۔ اگست کے کھلے ہوئے دن اور ستمبر کی اداس روشنی۔ جھاڑیاں، گھاس اور پیڑ اپنا رنگ بدلنے لگتے۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر اپنی تھکی ہوئی آنکھیں موند لیتی۔ پھر کچھ دیر بعد دبے پاؤں ہال والے کمرے میں جاتی۔ اوپر پاپا اور ممی سو رہے ہوتے۔ وہ روشنی نہ کرتی۔ سارے فون نمبر اسے معلوم تھے۔ وہ اندھیرے میں ڈائل گھماتی اور دوسری طرف گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگتی۔ وہ سو رہا ہوگا۔ ویران گھر کے سائے میں فون کی گھنٹی گونج رہی ہوگی۔ ہیلو... ہیلو... فیلٹی کی آواز اسے چونکا دیتی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہتی۔ ہیلو... ہیلو... ہیلو... اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ وہ ریسیور رکھ دیتا اور وہ فون پر دھیرے سے کہتی۔ فیلٹی میں ہوں۔ میں صرف تمھاری آواز سننا چاہتی تھی...“

وہ نومبر کا مہینہ تھا اس کی آواز دلّی کی فضاؤں میں گونجنے لگتی۔ چلتے ہوئے لوگ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھک جاتے اور سوچنے لگتے۔ کون ہے یہ فیلٹی۔ لیکن شہر کی ہوا میں اتنے نام، اتنی سانسیں، اتنے آنسو بہتے رہتے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا کہ کس کا نام کس نے پکارا ہے۔ لوگ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتے۔ اس کی آواز کو بھول جاتے اور بھیڑ میں گم ہو جاتے۔ لیکن وہ کبھی نہ بھول پاتی۔ یہ میرا راز ہے۔ وہ سوچتی۔ میرا سب سے بڑا راز۔ سب سے بڑا طلسم۔ فیلٹی! مجھے دیکھو تب تمھیں محسوس ہوگا کہ تم سب سے بڑی پاکھنڈی، جھوٹی، ہپوکریٹ‘ دنیا کی سب سے بڑی ہپوکریٹ لڑکی کو دیکھ رہے ہو۔ تم ہنس رہے ہو۔ لیکن ٹھہرو! تمھیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔ یہ میری پوٹلی ہے۔ ہنسو نہیں۔ کھولو۔ کھول کر دیکھو۔ نہیں یہ تھیسس کے نوٹس ہیں۔ انھیں الگ کر دو۔ یہ شاعری سے متعلق پنگوین کی مختصر کتابیں نہیں ہیں۔ پیسواؤ، انا اخمالوو، نرودا۔ نہیں یہ نہیں۔ یہ کاغذ، یہ نوٹس، یہ سائنس نہیں... پھر، پھر کیا؟

سنو! تمھارے گھر سے جب میں اپنے گھر لوٹتی ہوں تو بہت دیر تک نیچے لان میں کھڑی رہتی ہوں۔ اندھیرے میں دیکھتی ہوں۔ زرد اینٹوں کی دیوار، ہری کھڑکیاں، کھڑکیوں پر جھولتی ہوئی بیلیں۔ پورا ایک بنگلا، ایک پورا مکان، جانتے ہو۔ وہ اسے میرے لیے چھوڑ جائیں گے۔ میں کھلی آنکھوں سے ان کھڑکیوں اور ہوا میں سرسراتے ان پردوں کو دیکھتی ہوں۔ اب وہ کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوں گے۔ وہ خالی پلیٹوں کے سامنے اس وقت تک بیٹھے رہتے ہیں جب تک میں آ نہیں جاتی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے انتظار میں۔ آدھے جاگتے، آدھے سوئے ہوئے۔ فیٹی! جس طرح تم اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچتے ہو اسی طرح وہ میرے بارے میں سوچتے ہیں۔ ایک دن جب وہ نہیں رہیں گے، میں ان کے وصیت نامے سے ایک سانپ کی طرح باہر نکلوں گی۔ وہ سانپ جو ساری املاک اور اثاثے پر پھن پھیلا کر اسے ڈس لیتا ہے۔ (یہ سانپ) ایک ایسا کیڑا ہے جو زندگی بھر ان کے بزرگوں کے خون سے چمٹا رہتا ہے اور ان کے مرجانے پر کونوں میں جا کر ان کی ہڈیوں کو اس وقت تک چاٹتا رہتا ہے جب تک وہ بالکل صاف نہیں ہو جاتیں۔ ایک دن انھیں ہڈیوں پر بیٹھ کر جن پر خون اور گوشت کا نشان تک باقی نہیں، میں ان لوگوں میں مل جاؤں گی جو ہر جگہ موجود ہیں۔ نینی تال اور مسوری کی سڑکوں پر تم نے انھیں گھوڑوں پر سواری کرتے دیکھا نہیں۔ دوپہر کے وقت ویران آنکھوں سے وقت کو انگیز کرتے ہوئے وہ الگ الگ پوشاکوں میں آتے ہیں۔ دِلّی کی سڑکوں پر نادار لوگوں کے بارے میں تم نے انھیں بے ہودہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا نہیں۔ وہ بولتے ہیں، لکھتے ہیں، تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں۔ میں انھیں میں ہوں۔ وہ بازارو لوگ نہیں ہیں۔ میں ان سے الگ نہیں ہوں۔ وہ کتنی صاف، بے داغ اور کتنی چمک دار ہڈیوں پر بیٹھے ہیں۔ فیٹی میں انھیں میں شامل ہوں۔ ان سے الگ نہیں ہوں۔ میں باغ کے اجلے نیلے اندھیرے میں سب دیکھتی ہوں اور بھاگنے لگتی ہوں۔ میں چیختی ہوں فیٹی۔ بھاگتے ہوئے دروازے کے پاس آتی ہوں لیکن دروازے کا تالا بند ہے اور تم باہر سڑک پر ہو۔ اپنے گھر لوٹ رہے ہو۔ میں اندھیرے میں دیکھتی ہوں اور تب مجھے وہ دوپہر یاد آتی ہے جب

تم لائبریری میں آئے تھے۔ تم ایک اسٹیٹمنٹ لے کر آئے تھے، میں تمھیں اکثر دلّی کی سڑکوں پر دیکھا کرتی تھی، پیڑوں کے نیچے، گھاس کے اسکوائر پر، اس کنسرٹ —— —— میں جس میں مینوہن پہلی بار ہندستان آئے تھے۔ میں تمھیں دیکھا کرتی تھی اور سوچتی تھی، نہیں سوچتی کچھ نہیں تھی (بلکہ) حیران سی ہو جاتی تھی کہ کس طرح کچھ لوگ دوسروں کی نجات کے لیے گھومتے ہیں۔ وہ غیر معمولی لوگ ہوتے ہوں گے۔ پرم ہنس، مدر ٹریسا، مارٹن لوتھر کنگ ... وہ اپنا ہاتھ دوسرے کے شانے پر رکھتے ہوں گے اور سب کچھ بدل جاتا ہوگا۔ اس دن جب میں نے تمھیں لائبریری میں دیکھا تو سوچا کہ تمھارے کاغذ پر اپنا نام لکھوں گی اور ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جاؤں گی۔ پھر میں نے تمھیں دیکھا اور اچانک خیال آیا کہ میں تم سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ کسی بھی وقت اپنا گھر چھوڑ کر دلّی سے باہر جا سکتی ہوں۔ دوسری طرح سے دیکھو تم مجھ سے کہیں زیادہ قسمت والے ہو۔ تمھاری اپنی بصیرتیں ہیں۔ ذرا سا سوئچ دباؤ اور وہ چمکنے لگتی ہیں۔ روشنی کے یہ دائرے جنھیں تم کسی بھی وقت باہر نکال سکتے ہو، بڑے قرینے سے سجاتے ہو۔ پورا ایک میوزیم ہے جو کرزن روڈ سے لندن کی وکٹوریہ پارک تک پھیلا ہے۔ نہیں سچ مچ تم مجھ سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہو۔ ایک دن تم اپنے گھر کے کسی کونے میں ان لمحوں کی پوٹلی بھی رکھ لوگے جو میں نے تمھارے ساتھ گزارے تھے۔

یہ پوٹلی وہ اپنے ساتھ لائی ہے جانے سے پہلے وہ اسے دے دینا چاہتی ہے۔ اس پوٹلی میں مارچ کے پتّے ہیں اور جولائی کی راتیں اور گل مہر کے پھول ہیں جو مئی کے شروع میں کناٹ پلیس میں دہکتے تھے۔ کتابوں کی دکانیں ہیں اور ٹیلی فون کا بوتھ ہے ... منٹو برج ہے جس کے نیچے ایک دوپہر میں انھوں نے ایک دوسرے سے نجات حاصل کرنے کی دعا کی تھی ...

کیا کوئی ایسی اذیت ہے جو اس شہر کے کونے سے باہر نہیں آتی

وہ لائبریری سے باہر آئی تو دروازے پر فیلٹی دکھائی دیا۔ فیلٹی لپک کر اس کے پاس آیا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ "تم کب آئے؟" اس نے بہت نحیف آواز میں پوچھا۔

”میں دیر سے کھڑا ہوں،“ اس نے کہا۔

”تم لکھنے میں مصروف تھیں۔ میں باہر سے تمھیں دیکھ رہا تھا۔“ ”میں تمھیں کو لکھ رہی تھی،“ اس نے کہا اور فیٹی دھیرے سے ہنسنے لگا۔

”مجھے لکھ رہی تھیں؟ دکھاؤ۔“ ”ابھی نہیں“ اس نے اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اس سے اس کو بہت سکون ملتا تھا جیسے دن بھر کی تھکی ماندی چڑیا اپنے گھونسلے میں دبک جاتی ہے۔

”کیا لکھ رہی تھیں؟“ اس نے اس کے بالوں پر اپنا منہ رکھ دیا۔

”ایک بھید، ایک راز“ اس نے کہا ”ایک معمّہ۔“

”تم نے مجھے اسی لیے بلایا تھا۔ فیٹی نے اس کا چہرہ اٹھایا اور تب وہ دنگ رہ گیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ رو کر اٹھی ہو یا بخار میں مبتلا ہو یا پھر نیند میں چل رہی ہو۔

”اِرا!“ اس نے کہا۔

”شی... ارا نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”چلو“ اس نے کہا ”وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔“

وہ باہر چلے آئے۔ کرزن روڈ کی روشنیاں جنوری کے کہرے میں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ فیٹی نے اس کا تھیلا اپنے کندھے پر لٹکایا۔ وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ چھوٹے پیروں میں پیشاوری چپل، کالی کارڈرائے کی پینٹ، لمبا ڈھیلا براؤن سوئٹر جو ہمیشہ نیچے سے پھٹ جاتا تھا اور وہ اسے کالے دھاگے سے سی لیا کرتی تھی۔

”اسکوٹر لوگی؟“ فیٹی نے پوچھا۔

”نہیں پیدل چلیں گے... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں...“

”اِرا — کیا بات ہے؟“ وہ بیچ سڑک پر ٹھٹھک گیا۔ اِرا چلتی رہی۔ سر پر اسکارف باندھے، سلیٹی رنگ کا کرتا پہنے، ماتھے پر کالی بندیا لگائے۔ اس نے دل کی دھڑکنوں

کو یوں روک لیا جیسے کوئی تیراک کودنے سے پہلے اپنے سینے میں سانس روک لیتا ہے۔ یہی پل ہے۔ اس نے سوچا۔ یہی موقع ہے اگر میں ابھی نہیں کودی تو زندگی بھر کنارے کھڑی رہوں گی۔

”فیلٹی!“ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر دوسرا۔ پھر اس نے فیلٹی کا سوئٹر پکڑ لیا۔ وہ آگے بڑھی اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ ہوا میں اٹھ چکی تھی، وہ کود رہی تھی۔

”میں دلّی چھوڑ رہی ہوں“ اس نے کہا۔

وہ ساکت تھی۔ سب کچھ ساکت تھا۔ جنوری کی اس شام میں وہ چپ چاپ چلتے ہوئے انڈیا گیٹ کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

”کب؟ فیلٹی نے پوچھا۔ ”کہاں جاؤ گی؟“

وہ کھڑی ہو گئی۔ دھند کے درمیان پہلی جنگ عظیم میں مرنے والے کسی نامعلوم سپاہی کی یاد میں ایک لو جل رہی تھی۔ ”میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا اس (ارا) نے کہا ”ہندوستان بہت بڑا ہے“ دھیرے سے ہنستے ہوئے اس نے فیلٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں کہیں بھی جا سکتی ہوں“

”گھر چھوڑ دو گی؟“

ایک لمحہ کے لیے وہ اس ویران سڑک پر ٹھٹھک گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت ماں اپنے کمرے میں استری کر رہی ہوں گی۔ کھانے کی میز پر تین پلیٹیں لگی ہوں گی۔ پاپا ٹیلی وژن دیکھ رہے ہوں گے۔ میں ان سب کو چھوڑ رہی ہوں۔ اب نہ گھر ہوگا نہ ان کا پیسہ۔ میں کہیں بھی رہوں گی بھوکی نہیں مروں گی۔ میں محفوظ ہوں بالکل محفوظ۔ شدید مایوسی کے عالم میں اس نے انڈیا گیٹ کو دیکھا۔ ہلکی چاندنی میں وہ ریت کا ایک ڈوہ جان پڑتا تھا۔ چاروں طرف لمبی لمبی گھاس ہلتے ہوئے پیڑ۔ ”فیلٹی!“ اس نے کہا ”میری ایک بات مانو گے؟“

”کیا ارا؟“ اس نے بہت دھیمے لہجے میں پوچھا۔

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا ”تم کبھی اپنا گھر نہ چھوڑنا“

”لیکن اس دن تو...“ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ پورا کیا ”تم

مجھ سے باہر جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔"

"باہر"

"باہر۔ باہر کی دنیا میں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے فیلٹی کے ماتھے پر پڑے ہوئے بالوں کو ہٹایا اور کہا "تب میں نہیں جانتی تھی کہ وہ تمھیں میں رہتے ہیں۔ وہ گھر ہی میں ہیں۔"

"وہ کون؟" فیلٹی نے جھجکتے ہوتے ہوئے کہا "ارا! وہ تو کب کے مر گئے۔"

"مر گئے۔" وہ دھیرے سے ہنسی ... برآمدے میں رکھی کرسی، بستر کے عقب میں آسمان۔ ستاروں کی کہکشاں۔ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ "فیلٹی مجھے دیکھو۔" اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر سانس لینا چاہی لیکن پھر اسے روک لیا اور زرد چاندنی میں اپنی نظریں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کیا میں زندہ ہوں۔"

دھند اوپر کی طرف اٹھی اور پیڑ سرسرانے لگے۔ رات کی ہوا میں جینا، مرنا، گھر چھوڑنا سب کچھ ناممکن سا معلوم ہوا "فیلٹی۔" اس نے کہا "تمھارے باپ کا ایک رجسٹر تھا جس میں وہ کچھ لکھنا چاہتے تھے ... تمھیں یاد ہے؟"

فیلٹی نے اوپر دیکھا۔ دھند کے پار تارے چھٹک رہے تھے۔ ایک ــــ باریک سا اُجالا پیڑوں کی چوٹیوں پر بکھرا ہوا تھا۔ لائف ہیئر اینڈ ہیئر آفٹر۔ کیا دونوں ایک ساتھ ایک ہی دنیا میں نہیں ہیں۔ زندگی یہاں اور وہاں۔ وہ ہمارے ساتھ جی رہے ہیں اور ہم ان کے مرنے میں شامل ہیں؟"

ارا اب اس کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ پھاٹک کھلا تھا۔ دونوں طرف یوکلپٹس کے پیڑ اور بیچ میں بجری والی سڑک اور ایک نیبو کی جھاڑی۔

"فیلٹی تمھیں یاد ہے؟"

"کیا بِٹی؟ کبھی کبھی وہ پیار سے اسے بٹی کہا کرتا تھا۔ ایک بے سہارا بچی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر دلّی کی سڑکیں پار کیا کرتی تھی۔

"کیا یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔ اور اسی وقت اس نے دیکھا کہ ارا پھاٹک

کا پلا پکڑ کر اندر کہیں اندھیرے میں جھانک رہی ہے۔

”ایک بار اور کہو“ اس نے کہا۔

”کیا؟“

”جو ابھی کہا تھا“

”بٹّی!“

اس نے فیلیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں فیلیٹی کے چہرے کو ڈھونڈنے لگیں ”ہم پچھلی جنوری میں ملے تھے۔ میں نے تمھیں فون کیا تھا تو تم گنتی گن رہے تھے۔ پورے بارہ مہینے...“

لان کی خاک آلود نم روشنی میں وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”تم آج کیا لکھ رہی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”لائبریری میں؟“ اس نے فیلیٹی کے دونوں ہاتھوں سے اپنے رخساروں کو ڈھک لیا۔ اسی طرح جس طرح ماچس کی لَو کو روشن رکھنے کے لیے ہم اسے ہاتھوں سے ڈھک لیتے ہیں۔ اور وہ جلنے بجھنے کے سے عالم میں ہوا میں جھلملاتی رہتی ہے۔

”ایک اسٹیٹمنٹ“ اس نے کہا ”ایک درخواست، جو میں اپنے نام لکھ رہی تھی۔ پھر مجھے اچانک پتہ چلا کہ جب کوئی اعترافِ گناہ کرتا ہے تو یہ اعتراف صرف اپنے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے بھی ہوتا ہے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ تم بھی اس میں شامل ہو۔ ایک سال پہلے بھی ایک اسٹیٹمنٹ پر میں نے اپنا نام لکھا تھا۔ جانتے ہو میرے نام کے اوپر کس کا نام تھا؟“

”کس کا بٹّی؟“

”اذیّت کا“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”جب تم باہر جانے لگے تو میں نے سوچا کہ میں تم سے پھر ملوں گی...“

اندھیرے میں چابیوں کے کھنکنے کی آواز آئی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں چوکیدار کا چہرہ دکھائی دیا۔ ”بی بی جی گیٹ بند کرنا ہوگا“۔ اس نے کہا اور محبت آمیز نگاہوں سے فیلیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کو ایک عرصے سے دیکھتا آ رہا تھا۔

فیلیٹی نے اس کا تھیلا کاندھے سے اتارا۔ وہ تھیلا جس میں تھیسس کی فائلیں، کتابیں

اور ان سب کے نیچے ایک ناشتے دان دبا رہتا تھا۔

''تم آؤ گے؟'' اس نے چپکے سے پوچھا تاکہ چوکیدار اس کی آواز نہ سُن سکے۔

''میں تمھیں دیکھوں گی۔''

گیٹ بند ہو جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا رہا اور بجری والی سڑک پر اس کے چلنے کی آواز سنتا رہا۔ پھر وہ بھاگنے لگا۔ بنگلے کے احاطے کے باہر ایک تنگ سا راستہ تھا۔ وہاں سے اس کا کمرہ دکھائی دیتا تھا۔ چھت پر ایک روشنی کا دِیا۔ گھر لوٹنے سے پہلے وہ ہمیشہ اسے دیکھا کرتا تھا۔

کئی برس بعد وہ مکان خالی ہو گیا۔ اب وہاں دوسرے لوگ رہتے ہیں لیکن فیٹی جب بھی ادھر سے گزرتا ہے ایک لمحے کے لیے تاریک گلی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے برسوں پہلے کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہی ہوا میں جھومتے ہوئے یوکلپٹس کے پیڑ، نیبو کی جھاڑی، لان کے اوپر اس کا کمرہ ... وہ انتظار کرنے لگتا ہے۔ اب وہ آئی ہو گی، کمرے کی بتّی جلائی ہو گی۔ اب کوئی ریکارڈ لگا کر بستر پر لیٹ گئی ہو گی۔ ایک نورانی سی آواز اینٹوں کی دیوار سے کانچ کے ٹکڑوں پر پھسلتی ہوئی اس کے پاس آتی اور اس سے لپٹ کر سرگوشی کرتی ''فیٹی! میں یہاں ہوں —— یہاں —— میں یہاں ہوں۔

صبح کی سیر

وہ چھتری اُٹھاتے ہیں۔ داہنے پیر سے سیڑھیاں اترنا شروع کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دن کو اگر داہنے پیر پر اُٹھایا جائے تو وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں گے۔ صبح اُٹھتے بھی وہ داہنی کروٹ سے ہیں اور جب ان کی بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو انھیں اپنے لڑکے کا خیال آتا ہے جو برسوں سے پردیس میں ہے۔

چھتری گھماتے ہوئے وہ نالے کی طرف چلنے لگتے ہیں۔ اب وہاں نالا نہیں ہے۔ تین برس پہلے کمیٹی نے اسے پاٹ دیا تھا۔ لیکن پاس پڑوس کے لوگ اب بھی ان کے گھر کو۔ نالے والا مکان ہی کہتے ہیں۔ پرانے دوستوں کے خطوط اب بھی اسی پتے پر آتے ہیں: کرنل نہال چند۔ نالے والا مکان — اور ڈاکیہ بھی ان خطوں کو سیدھا اُنھیں کے پاس لے آتا ہے۔

وہ چلتے چلے جاتے ہیں۔ نالے کے پار سفید چونے سے پُتی ہوئی ایک چھوٹی سی پلیا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ ان کی صبح کی سیر کا پہلا اسٹیشن ہے۔ وہ اپنی چھتری کو پلیا کے سہارے ٹکا دیتے ہیں۔ تھیلے کو کندھے سے اتار کر موٹھ پر لٹکا دیتے ہیں پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں تقریباً Attention کے عالم میں۔ ایک سانس اندر کی طرف کھینچتے ہیں پھر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر دوسری سانس کھینچتے ہیں۔ وہی کساؤ اور وہی ڈھیلا پن۔ پھر تیسری سانس ...... اس سے اُنھیں کچھ آرام ملتا ہے! یہ بات کسی کو معلوم نہیں، یہ بات وہ خود سے بھی نہیں پوچھتے اور کوئی دوسرا بھی ان سے نہ پوچھتا

کہ ایسا وہ کس لیے کرتے ہیں۔

اُنھیں اس کی بھی فکر نہیں کہ پُلیا کے نیچے اسکول جاتے ہوئے لڑکے اُنھیں دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ سینک سلائی سا ایک آدمی ہوا میں سانس لیتا ہوا۔ بانس کی طرح ہلتا ہوا۔

"کرنل صاحب...... کرنل صاحب......"

"آپ کی بندوق اور تلوار کہاں ہے؟"

بچّے اُنھیں دیکھ کر چیختے ہیں قہقہے لگاتے ہیں پھر ڈر کر دور بھاگ جاتے ہیں۔ بارش کے پانی میں ان کے چھپ چھپ کرنے کی آواز آتی ہے اور گھاس ہوا میں سرسراتی رہتی ہے۔

اس دن نہال چند کے کانوں میں دیر تک بچّوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ انھوں نے آخری سانس کھینچی لیکن سانس کھینچتے ہی انھیں اچھو ہو گیا۔ انھوں نے پُلیا پر سے اپنی چھڑی اُٹھائی اور رومال سے اس کے اوپری سرے کو صاف کیا۔ اسی رومال سے انھوں نے ناک چھنک کر صاف کی اور اسی رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ پھر تھیلا اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ ایک دھندلا سا خیال آیا۔ کہ شاید اندر کہیں کوئی تکلیف ہے لیکن اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ اس تکلیف کو پیاس کا نام دے سکیں۔ وہ اذیتوں کی گرد میں رہتے تھے۔ ان تکلیفوں کو کوئی نام دینے کا مطلب تھا مصیبتوں کی پٹاری کا کھولنا جس کے اندر سے معلوم نہیں کتنی دوسری تکلیفیں باہر نکل پڑیں گی۔ نا بھائی...... اس سے بہتر تو یہ دُھند ہی ہے جہاں سب کچھ ایک سا ہے۔

نہال چند پلیا پار کرنے لگے۔

آگے پیچھے اور نشیب میں میدان ہی میدان ہے لیکن پوری طرح میدان بھی نہیں۔ آدھا حصّہ دھوبی گھاٹ میں بدل گیا ہے اور آدھا حصّہ پیڑوں سے ڈھک گیا ہے۔ وہ نالا جو شہر کے اندر پاٹ دیا گیا تھا یہاں پر بڑی روانی سے بہتا ہے۔ کنارے پر چوڑے اور نکیلے پتھر بکھرے ہوئے ہیں جو آنکھوں میں نیزے کی طرح چبھتے ہیں۔ نہال چند نے

اپنے تھیلے میں سے دھوپ کا چشمہ نکالا اور اسے پہن کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو خنک سا اندھیرا محسوس ہوا۔ رات کے ساکت اندھیرے کی طرح نہیں بلکہ سیاہ روشنی کے ایک دریا کی طرح۔ کرنل دھیرے دھیرے اس میں اترتے ہیں اور پتھروں سے بچ بچ کر چلنے لگتے ہیں۔

"کہاں جا رہے ہیں کرنل بابو؟"

پتھروں پر کپڑوں کو پیٹتی ہوئی دھوبنوں کی آنکھیں اوپر اُٹھتی ہیں اور ہاتھ ہوا میں اچانک رک جاتے ہیں؛ دھوبیوں کے کتے ـــ گھر کے نہ گھاٹ کے ـــ کرنل نہال چند کی خاموش خو دھیمی چال دیکھ کر کچھ زیادہ ہی غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ دانت باہر نکالے غراتے ہوئے وہ ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں لیکن پاس آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ ان کی گز بھر لمبی چھڑی کو دیکھ کر اپنے اور کرنل صاحب کے درمیان گز بھر کا فاصلہ رکھنا نہیں بھولتے۔ اور نہال چند؛ ان کے لیے جیسے چیختے ہوئے بچے ویسے ہی غراتے ہوئے کتے۔ سب ایک رواں منظر کا حصّہ ہیں۔ ایک دھوئیں کی سی آواز ـــ جس میں سب کچھ سما جاتا ہے۔

یہ منظر اگر آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے تو صرف ایک جگہ ـــ وہاں جہاں سے جنگل شروع ہوتا ہے۔ وہاں نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی رنگ نہ روشنی۔ صرف پیڑوں کی لمبی قطار کے نیچے دھوپ کے نقطے ٹمٹماتے ہیں۔ یہاں سیاہ چشمے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہال ایک کندھے سے تھیلا اتار کر دوسرے کندھے پر لٹکا لیتے ہیں۔ کوٹ کے بٹن کھولتے ہیں تو نومبر کی ہوا سینے پر وار کرتی ہے۔ اوپر پیڑ نیچے جھاڑیاں۔ بیچ میں گل مہر کی سرخ پتّیاں۔ سُر سُر کی آوازیں جنھیں سن کر نہال چند کو گوالیار کے جنگل یاد آ جاتے ہیں جہاں وہ اپنے فوجی دوستوں کے ساتھ شکار پر جاتے تھے۔ اب انھیں ان جنگلوں کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ پردے پر سلائڈ کی طرح اچانک کوئی چیز چمک اُٹھتی۔ گزری ہوئی زندگی کا ایک حصّہ سطح پر نمودار ہوتا اور پھر اندھیرے میں ڈوب جاتا اور نہال چند تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے جنگل میں غائب ہو جاتے۔

کچھ دیر تک تو معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہیں۔ کس طرف گئے ہیں۔ جھاڑیوں میں صرف سرسراہٹ سی سنائی دیتی جیسے کوئی جانور بھاگا جا رہا ہو۔ پھر اچانک ان کا سر دکھائی دیتا۔ گھڑی میں یہاں گھڑی میں وہاں۔ اگر کوئی چھپ کر انھیں دیکھتا تو حیرت میں پڑ جاتا کہ اس عمر میں بھی چھڑی اور تھیلے کے ساتھ وہ اس برق رفتاری سے چل سکتے ہیں لیکن نہال چند کے لیے تو یہ معمولی قسم کی ورزش ہوا کرتی۔ صرف ورزش نہیں بلکہ ایک طرح کا مراقبہ۔ ان کا چہرہ کسی اور دنیا کے خیال میں ڈوبا رہتا۔ انھیں اس عالم میں دیکھ کر وہم ہونے لگتا کہ وہ ایک جگہ جم سے گئے ہیں صرف ان کی لمبی پتلی ٹانگیں حرکت کر رہی ہیں پھر ان کی ٹانگیں بھی بے حرکت ہو جاتیں۔ صرف ان کا بوڑھا دل ہڈیوں کے پنجرے سے ٹکراتا رہتا..... وہ رک جاتے نیم وا پلکوں کو پوری طرح وا کرتے اور چاروں طرف دیکھنے لگتے۔

سامنے ہوا محل دکھائی دیتا۔ زرد پتھروں کی مغلیہ عمارت نومبر کی ہلکی دھوپ میں تپتی ہوئی.....

نہال چند کے سفید بالوں سے بہتا ہوا پسینہ ان کی کن پٹیوں پر ٹپکنے لگتا۔ وہ سر کو جھٹکا دے کر رومال سے پیشانی پونچھتے پھر چھڑی اور تھیلے کو ہوا محل کی سیڑھیوں پر رکھ دیتے، سانس کھینچتے اور سیر کی ساری تکان ان کے سینے سے نکل کر اس لوٹے ہوئے کھنڈر میں شامل ہو جاتی۔

یہ ان کی سیر کا دوسرا پڑاؤ ہوتا۔

اس ہوا گھر میں صدیوں پہلے واقعی کسی کا پڑاؤ ہوا ہوگا۔ مغل فوجوں کا پڑاؤ۔ دلی سے کوچ کر کے یہاں پل دو پل کے لیے وہ ڈیرا ڈالتی ہونگی۔ خود بادشاہ بھی شاید فرصت کے دنوں میں یہاں سیر و تماشا کی غرض سے آتے ہوں گے، ورنہ اس اجاڑ جنگل میں اتنی سبک اور خوبصورت میناکاری والی عمارت ہی کیوں بناتے؟ نہال چند کو یہ گمشدہ خزانہ اچانک ہی مل گیا تھا۔ ایک دن سیر کرتے کرتے اس مقام تک آ پہنچے۔ آنکھ اٹھائی تو یہ ہوا گھر نظر آیا۔ سفید سیڑھیاں محرابی جھروکے۔ بڑے بڑے روشن دان لیکن جو چیز نہال چند کو ہمیشہ حیرت میں ڈال دیتی تھی وہ تھا اس عمارت کا نیلا گنبد۔ بھورے زرد جنگل میں یہ نیلا پن ان کی آنکھوں کو عجیب سی راحت بخشتا تھا ایک سرد شفاف ہیرے کی طرح جھلملاتا ہوا۔

اس روز بھی نہال چند گنبد کو دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے ایک لمبی سانس لی جو "آہ" اور "اے میرے پروردگار" کے سے فقروں کے سوز میں کہیں دب گئی۔ انھوں نے تھیلے سے ایک خاکی رنگ کی برساتی نکالی اور ہوا گھر کی سیڑھیوں کے نیچے قرینے سے بچھا دی۔ یہ ان کی محبوب جگہ تھی...... جھروکوں سے آتی ہوئی ہوا میں ہلتا ہوا گنبد اور نومبر کی دھوپ — انھیں اب اور کیا چاہیے؟

نہ کوئی آواز نہ کوئی شور نہ کسی طرح کی ہلچل۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک تنکا بھی ہلتا تو اس کی آواز سے نہال چند کی نسیں پھڑ پھڑانے لگتیں۔ کبھی کبھی کسی جنگلی پرندے کی آواز فضا میں بلند ہوتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنی بھوکی چیخ سے نہال چند کی بھوک کو ہوا دے رہا ہو۔ اس کی چیخ سُن کر نہال چند کو دن کے کھانے کی یاد آجاتی اور ان کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پوٹلی کی طرف بڑھ جاتا۔

اس کھانے میں ابلا ہوا انڈا، ٹماٹر، کھیرے کے سینڈوچ —— اور کافی۔ سب کچھ ہوتا۔ (ان کا نوکر) دیوی سنگھ ہر چیز بڑے قرینے سے رکھتا تھا۔ اس پہاڑی چھوکرے کو سب کچھ یاد رہتا — یہاں تک کہ وہ نمک اور کالی مرچ کی پڑیا بھی رکھنا نہ بھولتا۔ تھیلے کے ایک کونے میں جرمنی کا وہ ٹرانسسٹر بھی پڑا رہتا جسے مُنّو، کرنل صاحب کی اکتاہٹ اور خالی پن کو مٹانے کے لیے ولایت سے لایا تھا۔ کئی بار کرنل صاحب کا جی چاہا کہ یہ ٹرانسسٹر دیوی سنگھ کو دے دیں۔ وہ بھی تو دن بھر سائیں سائیں کرتے مکان میں اونگھا کرتا ہے۔ گھڑی دو گھڑی اس کھلونے سے ہی کھیل لیا کرے گا۔ لیکن پھر اپنا ارادہ بدل دیتے۔ بے آواز ٹرانسسٹر میں اُنھیں اپنے بیٹے کی آواز سنائی دیتی۔ "آپ دن بھر خالی بیٹھے رہتے ہیں۔ اسے ہی سُنا کیجیے گا۔" اس وقت ان پر ایک عجیب سا سناٹا طاری ہو جاتا۔ ایک لمبی جماہی لیتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگتے:

"خالی کہاں میرے خدا۔ مجھے تو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔"

خدا معلوم یہ کہتے وقت وہ کس سے مخاطب ہوتے۔ اپنے بیٹے سے جو پردیس میں تھا یا اپنی بیوی سے جواب اس دنیا میں نہیں تھی یا خدائے برتر سے جو کہیں نہیں تھا۔ انھیں

شاید خود بھی اس کا علم نہ ہوتا کہ وہ اپنے آپ سے کیا کہتے ہیں۔ ہوا میں جہاں اتنی آوازیں گونجتی ہیں۔ وہاں انھیں اپنی باتیں بھی اڑتی ہوئی معلوم پڑتیں۔ اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ آپ کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ آخر آپ کرتے کیا ہیں۔ تو وہ جھٹ سے کہتے کہ دیکھتے نہیں کھانا کھا رہا ہوں اور واقعی وہ اس وقت کھانا کھا رہے ہوتے ــــ کھانا، دیکھنا، چلنا، سونا ــ نہال چند کے یہ سارے کام ایک رَو میں ہوتے تھے۔ درمیان میں وہ خود سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور ان باتوں کو خود ہی سنتے بھی جاتے۔

سننے کا عمل سوتے میں بھی جاری رہتا۔ کھانے کے بعد ان پر نیند طاری ہونے لگتی۔ نہال چند ڈبل روٹی کے کناروں اور انڈے کے چھلکوں کو اخبار میں لپیٹ کر الگ رکھ دیتے اور تھیلے کی گٹھری بنا کر اسے برساتی کے سہارے لٹکا دیتے پھر پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے۔ لیکن اس سے پہلے کہ انھیں نیند آتی، پرندوں کا غول ان کی چھوڑی ہوئی چیزوں پر لوٹ پڑتا۔ پھر ٹھونگیں مارنے کی آواز آتی۔ کُٹ کُٹ . . . . کُٹ۔ نہال چند کو یوں لگتا جیسے پرندوں کی چونچیں اخبار پر نہ چل رہی ہوں بلکہ ان کی نیند پر وار کر رہی ہوں۔ چڑیوں کے بعد چیلیں آتیں اور چڑیوں کو بھگا کر بچی کھچی چیزوں کو اپنی چونچوں میں دبا کر غائب ہو جاتیں۔ چیزوں کو لے کر بھاگتے وقت ہوا میں ان کی پینترے بازی سے اس طرح کی آواز ہوتی گویا نیند میں کسی نے چھلانگ لگا دی ہو۔ سمٹتے ہوئے خواب بکھر جاتے۔ بادلوں کی سمٹتی ہوئی پرچھائیں میں نیلا گنبد کچھ ترچھا سا ہو جاتا اور نہال چند کو محسوس ہوتا کہ وہ سب کچھ ایک ہلتے ہوئے پردے کے پیچھے سے دیکھ رہے ہیں۔ لیٹا ہوا آدمی، سرہانے رکھا ہوا تھیلا، ہوا سے ہلتی ہوئی برساتی ــ نہال چند کا دل تیزی دھڑکنے لگتا۔ وہ سراپا انتظار بن جاتے۔

لڑکی ادھر یوں ہی نکل آتی تھی اور آ کر کچھ فاصلے پر ٹھٹھک جاتی تھی۔ گلے میں جھولتی رسّی بے چینی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ، جھروکوں سے جھانکتی آنکھیں ــ جو اس شخص پر ٹکی ہوتیں، جو سیڑھیوں کے نیچے خود ایک سیڑھی کی طرح پڑا رہتا۔

"نہالی رے، او نہالی
تیری ساری جیبیں خالی

ہائے نہالی
کیا سچ مچ خالی؟"

نہال چند اسی طرح چپ چاپ دم سادھے پڑے رہتے اور اس آواز کے قریب آنے کا انتظار کرتے۔ انھیں ڈر لگا رہتا کہ ذرا بھی حرکت کریں گے تو وہ آواز بھٹک کر جنگل میں گونجتی ہوئی دوسری آوازوں میں گم ہو جائے گی۔ اصل بات یقین کی ہے۔ جب لڑکی کو یقین ہو جاتا کہ اس پاس کوئی خطرہ نہیں ہے تو وہ آہستہ آہستہ جھجکتی ہوئی قریب آتی — چوکنی اور ہوشیار۔ اس لیے نہیں کہ نہال چند پر اسے بھروسہ نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ وہ زندہ ہیں۔ بے ضرر بھی اور خطرناک بھی۔ اس لیے وہ بالکل قریب نہیں آتی تھی۔ ہاتھ بھر کا فاصلہ ضرور رکھتی تھی۔ دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر نہال چند کے فوجی اوورکوٹ کی لمبی تاریک جیبیں ٹٹولنے لگتی ان جیبوں پر اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے رینگتی رہتیں۔ نہالی او نہالی۔

کیا پوچھ رہی ہے۔ خالی جیبوں میں کون سا راز ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کا لمس پاتے ہی خون ان کی رگوں میں دوڑنے لگتا اور ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور نہال چند اپنے جسم کا پنجرہ کھلا چھوڑ دیتے۔ جانے دو اندر کوئی کہتا، بھاگنے دو، اسے کب تک بچا کر رکھو گے۔

اس وقت مکمل سکوت ہوتا۔ نومبر کی مری مری سی دھوپ ہوا گھر کے کنکالی کھنڈر پر دھیرے دھیرے پھیلنے لگتی۔ پیڑ، پتے، جھاڑیاں کسی میں کوئی ہلچل نہ ہوتی۔ نہال چند سانس روکے انتظار کرتے۔ ایک تنکا بھی ہلتا تو ان کا سینہ تن جاتا۔ پلکیں کس کر موند لیتے اور ان کے اندر آنکھوں کے ڈھیلے دھوپ میں رنگ برنگے دائروں کی طرح ناچنے لگتے اور اسی وقت ایک جھٹکے کے ساتھ وہ خود سے آزاد ہو جاتے۔ جسم الگ پڑا رہتا اور نہال چند — دوسری طرف چلے جاتے جہاں ان کا تیسرا اور آخری پڑاؤ ہوتا۔

وہاں انھیں کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ نہ ڈر نہ کھٹکا نہ کوئی گواہ۔ کھنڈر کے سائے میں وہ اوندھے پڑے رہتے۔ وہ ان کے پاس سرک آتی اور اپنے دوپٹے کو سینے سے اوپر کھسکا کر کندھوں پر ڈال لیتی اور ان سے لگ کر اکڑوں بیٹھ جاتی۔ تب نہال چند کو گمان ہوتا کہ پلکوں

کے پیچھے جو دھوپ کے دھبّے تھے وہ شلوار قمیض کے سرخ نقطے ہیں — وہ چاہتے تو انھیں چھو سکتے تھے، لیکن وہ ایسا نہ کرتے اور ظاہر کرتے گویا وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اس کی انگلیوں کو اپنے بدن سے کھیلنے دیتے — ”او نہالی، کیا سب کچھ خالی؟“

نہیں آج ان کی جیبیں خالی نہیں تھیں۔ آج میں سب کچھ ساتھ لایا ہوں۔ دیکھوگی؟ وہ اپنا سر تھوڑا سا اوپر اُٹھاتے تو اس کی سیاہ پُرنم آنکھیں انھیں لبھانے لگتیں۔ آنکھیں جو گذشتہ زندگی کے فریبوں کو ایک نظر میں تول لیتی ہیں۔

”کیا دکھائے گا بھوندو! سڑا ہوا آلوچہ، مرا ہوا تیتر یا کسی جھینگر کا مردہ جسم:“ بہت پہلے وہ لڑکی کو یہی چیزیں دکھایا کرتے تھے۔ وہ انھیں نیکر کی جیب میں ٹھونس کر لاتے اور ایک ایک کر کے نکالتے تھے۔ کسی بلی کی مونچھ، کسی بڑھیا کا بال؟

کچھ بھی نہیں اس دن جیب میں سے ایک بھی چیز نہیں نکلی جسے وہ پہچان سکتی۔ صرف کاغذوں کے ڈھیر تھے۔ بینک کی پاس بُک، تازہ خطوط، جائداد کے کاغذ اور ایک چھوٹی سی نیلی کتاب جس پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ یہ کرنل نہال چند کا پاسپورٹ تھا جسے وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ سڑک پر اگر کچھ ہو جائے تو پولس ان کی تصویر اور نام پتہ دیکھ کر ان کے ٹھکانے کا پتہ تو لگا ہی سکتی ہے۔ ہر تین سال بعد پاسپورٹ کے دفتر جا کر اس کی تجدید کراتے تھے۔ سوچتے تھے کہ کبھی لڑکے سے ملنے کی خواہش ہوئی تو کام آئے گا۔ تیری خواہش مری نہیں نہالی؟

خواہش! تتلی کی طرح اڑتا ہوا یہ لفظ نہال چند کے اردگرد گھومنے لگا۔ کیا کوئی ایسی جگہ بچی ہے جہاں وہ ایک لمحہ بیٹھ سکیں جو سچ مچ خواہش ہو جہاں وہ تنہائی میں آرام سے اپنے پر سمیٹ کر سمٹ سکیں۔ انھوں نے اپنے اندر جھانکا تو وہاں خواہش نہیں وہ لڑکی بیٹھی تھی۔ کون ہے یہ؟ گلے میں پھنسا دوپٹہ، زرد سا گول چہرہ، گرد سے اٹی ہوئی لٹیں۔ کودنے والی رسی جو پچھلے: پچاس سالوں سے ان کے ساتھ (کھنچ) رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ جو اچانک کاغذوں کے ڈھیر سے باہر نکل آئی تھی۔ نہال اپنی بے چینی نہیں چھپا سکے۔ انھوں نے اسے دیکھنے کے لیے سر کو نیچے جھکایا تو لڑکی کی نگاہیں اوپر کی طرف اُٹھ گئیں۔

”کون ہے یہ عورت؟“

عورت! انھیں جھٹکا سا لگا۔

”میری بیوی“ انھوں نے کہا۔

”سچ؟“

ہاں۔ سچ نہیں تو کیا ایسے ہی۔ نہال چند کا لہجہ کچھ دھیما پڑ گیا۔ اندر ہی اندر وہ دہلنے لگے۔

”اور یہ پہاڑ؟“

”پہاڑ؟“ نہال چند کا دھیان بھٹکنے لگا۔ نہیں یہ خواب نہیں تھا۔ پیچھے واقعی پہاڑ تھے۔ ننگے اور دھوپ میں چمکتے ہوئے۔ ان دنوں ان کی تعیناتی لداخ میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ رہتے تھے اس کے پیچھے مانیٹسری تھی اور وہاں دو بودھ بھکشو ان کی بیوی کو دیکھتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اور بیوی بازار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ . . . کیمرے سے بالکل بے خبر۔

ان کی بیوی؟ ہاں یہ وہی تھی۔ تصویر پر پھیلا ہوا چہرہ جس پر آخری بیماری کا خوف ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کیا وہ اسے دیکھ رہی تھی؟ نہیں۔ نہیں یہ تم دیکھتے ہو نہال چند وہ نہیں۔ کیمرے کا وہ لمحہ بھی اس کا چہرہ تھا۔ ہونٹ تھوڑے سے کھلے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ تم ہو۔ پہاڑ ہے۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے بودھ بھکشو، دکانوں پر ٹنگے ہوئے پرانے کپڑے۔ ہوا میں لہراتے ہوئے۔ اس دن کتنی ہوا تھی۔ ساڑی کا پلو بار بار اڑتا ہوا اس کے چہرے کو ڈھک لیتا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ تصویر میں سب کچھ ساکت تھا۔ وہاں ہوا بالکل نہیں تھی۔

وہاں تو صرف لڑکی کی انگلی تھی۔ گرد میں اٹی ہوئی۔ اس چہرے پر ٹکی ہوئی جوان کی بیوی کا چہرہ تھا۔ ایک میلا کاغذ، ایک دائرہ تصویر کا سایہ . . . .

”نہالی“ لڑکی کا لہجہ بہت دھیما تھا۔ کیا وہ کبھی آتے ہیں؟“

”کون؟“ انھوں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ”کون آتے ہیں؟“

”تمہارا لڑکا؟“

”وہ باہر ہے۔“

”اور یہ؟“ لڑکی نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پاگل!" نہال چند اس کی حماقت پر ہنس دیے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

"پھر تم؟"

"میں کیا کٹّو؟"

پہلی بار ڈرتے ڈرتے ان کے مُنہ سے لڑکی کا نام نکلا۔ "میں کیا؟" کیا مطلب ہے اس کا؟" لڑکی حیرت زدہ نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگی۔ اس کا مُنہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا...

"نہالی؟"

کیا؟

مجھے دیکھتے ہو؟

نہال چند اسے خالی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اچانک خیال آیا کہ اتنے برسوں بعد بھی کٹّو کتنی ٹھنگنی اور چھوٹی سی دکھائی دیتی ہے۔ یونہی۔ سالوں پہلے جب وہ واقعی چھوٹی تھی تو کتنی لمبی اور جوان دکھائی دیتی تھی۔ کیا وقت اُلٹا چلتا ہے۔ نہیں یہ ان کا وہم ہے۔ شاید بچپن میں ہر چیز بڑی دکھائی دیتی ہے۔ گھر، شجر، ماں، باپ اور — اچانک نہال چند چونک پڑے۔ جیسے لڑکی نے پیچھے مڑ کر ان کے کانوں میں بدبدایا ہو۔ اور — محبت، نہیں تو کیا؟

محبت؟ کیا تم کسی سے محبت کر سکے نہالی؟ کرنل نہال چند!

ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ہوش میں آئے۔ کس کی آواز تھی یہ۔ یا محض فریب اور دھوکا تھا۔ اندر کی بے ربط پکار۔ جو بڑھاپے کے جنگل میں گونجتی ہے، دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور دروازہ کھولو تو کوئی نہیں ہوتا۔ صفر کا لامحدود پھیلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ اندر کا لہو باہر کی تپتی گرم دھوپ پر چمکتا ہے۔ نہ انس، نہ لگاؤ، نہ محبت کا دُکھ۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بیوی کا چہرہ نہ بیٹے کی یاد کچھ بھی نہیں۔ صرف میں۔ تم کون نہال چند۔ کون ہو تم؟

کھٹ، کھٹ۔ کھٹ...... وہ رسّی کود رہی تھی۔ اوپر نیچے، نیچے اوپر.... ویران کھنڈر میں اس کے پیروں کی چاپ نہال چند کی بند پلکوں پر دستک دینے لگی۔

وہ سو رہے تھے۔ کھانے کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی ضرور سو لیتے تھے۔ جب وہ سو رہے

ہوتے تو چیلوں اور دوسری چڑیوں کے غول ہوا گھر کے جھروکوں میں بیٹھ جاتے۔ نہال چند کی بچی کھچی چیزیں کھا کر ان کی نگاہیں نہال چند کے جسم پر ٹھہر جاتیں۔ جیسے یہ پرندے کچھ سوچ رہے ہوں۔ کیا یہ بدن بھی ان کی غذا میں شامل ہے؟ انھیں بڑی مایوسی ہوئی جب نہال چند نے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے آسمان دکھائی دیا..... نومبر کا نیلا ٹکڑا۔ وہ ان کی نیند سے نکل کر گنبد پر آٹکا تھا۔ نیلا اور سفید، سردیوں کے کہرے میں خواب کے پھاہے جیسا؛ نیند کی دھند میں ان کا آدھا جسم سویا رہتا اور آدھا جسم باہر کی دنیا کو دیکھتا..... دیوی سنگھ! انھوں نے دھیرے سے آواز لگائی۔ پھر اچانک یاد آیا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں باہر لیٹے ہیں۔ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر انھوں نے تھیلے کو ٹٹولا۔ وہ تھرمس نکال کر اس کے اندر بچی ہوئی کافی سے اپنا گلا تر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا ہاتھ تھیلے پر نہیں کاغذوں کے ڈھیر پر جا پڑا۔

کاغذ ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ پنشن کے کاغذات، فوٹو، خط، کھلا ہوا پاسپورٹ۔ نہال چند نے جھٹکے سے سر ہلایا...... یہ کیسے نکل آئے؟ انھیں ٹھیک سے یہ نہ آیا کہ کب انھوں نے ان کاغذوں کو اپنی جیب سے باہر نکالا تھا؟ کچھ چیزیں ان کی حس کے دائرے سے باہر نکل جاتی تھیں اور غیر محسوس طریقے پر واقع ہو جاتی تھیں اور اچانک ان کے سامنے آ موجود ہوتی تھیں۔ دیکھو، یہ ہم ہیں تمھارے سامنے اور تمھیں خبر تک نہیں۔ اور نہال چند کھسیا کر انھیں قبول کر لیتے تھے۔ ان میں یہ پوچھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ میں نے تو تمھیں جیب میں رکھا تھا۔ تم باہر کیسے نکل آئیں؟ سچ پوچھیے تو یہ چیزیں نہال چند کو آدمیوں سے کہیں زیادہ عزیز اور سمجھ دار معلوم ہوتی تھیں۔ پالتو جانوروں کی طرح وہ برسوں ان کے ساتھ رہی تھیں اور کبھی انھیں دھوکہ نہیں دیا تھا۔ وہ دیکھ کر نہیں صرف چھو کر ہی ان پرانی اور بوسیدہ چیزوں کو پہچان لیتے تھے۔ یہ منّو کا خط ہے۔ یہ بینک کا پاس بک ہے۔ یہ لداخ کی تصویر ہے۔ اور یہ؟ اچانک چیزوں کو ٹٹولتی ہوئی ان کی انگلیاں ٹھٹھک گئیں۔ آنکھیں کھولیں تو دیوی سنگھ کا پوسٹ کارڈ دکھائی دیا جو اس نے چھٹیوں میں گاؤں سے بھیجا تھا.....

دیوی سنگھ کا خیال آتے ہی وہ ہڑبڑا گئے۔ وہ برآمدے میں پالتی مارے بیٹھا ہوگا۔ پتہ نہیں کتنی بار کھانا گرم کیا ہوگا، دروازہ کھول کر باہر جھانکا ہوگا۔ انھیں اکثر دیر ہو جاتی تھی۔

دیوی سنگھ بڑی بڑی پہاڑی آنکھیں اُٹھا کر دروازے کی طرف شدید حیرت کے عالم میں دیکھتا تھا۔ کہتا کچھ نہیں تھا لیکن ہر بار ایک ہی سوال اس کی خاموش نگاہوں میں نظر آتا تھا۔ آپ کہاں جاتے ہیں؟ صبح کی سیر اور شام تک غائب۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو کہاں ڈھونڈھتا پھروں گا؟ نہال چند ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے لیکن اندر اندر دل دھڑکتا رہتا کہ کہیں دیوی سنگھ ان کی شکایت منو کو نہ لکھ بھیجے۔ ولایت جانے سے پہلے وہ بار بار ان سے کہہ گیا تھا کہ دیوی سنگھ کے سوا آپ کے پاس کوئی نہیں..... وہ چلا گیا تو آپ اپاہج ہو جائیں گے۔ اپاہج! ٹھیک ہے ہو جاؤں گا، تم تو دیکھنے نہیں آؤ گے۔ برآمدے میں پلنگ ڈال کر پڑا رہوں گا..... مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے اب سب کچھ ایک جیسا ہے۔ جیسی رات ویسا دن..... انھیں غصہ آنے لگا۔ مایوسی اور بے بسی والا غصہ، اس پانی کی طرح جو ریگستان کی تپتی زمین پر برستا ہے اور سوکھ جاتا ہے۔ جس کے برسنے سے زمین پر ذرا بھی سبزہ نہیں اُگتا۔

ریگستان! ان کے ہاتھ بکھرے ہوئے کاغذ پر ٹھٹھک گئے۔ ان کی آخری تعیناتی وہیں ہوئی تھی۔ راجستھان اور پاکستان کی سرحد پر۔ چاروں طرف ریگستان پھیلا تھا۔ اب سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ لیکن ان دنوں وہیں بس جانے کو جی چاہتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ پر آ پہنچے ہیں۔ گھنٹوں ریگستان میں گھومتے رہتے۔ ریت کے ٹیلوں پر بیٹھے رہتے۔ نہ بیوی کی یاد آتی نہ لڑکے کی۔ سونے لمحوں میں یہ محسوس ہوتا جیسے وہ دھیرے دھیرے کسی سچائی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس اندھیرے کنویں کی تہہ کو چھو رہے ہیں جو عمر کے آخری کنارے پر انھیں اس قدر اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ کبھی کبھی حیرانی بھی ہوتی تھی کہ جو سچ انھیں لداخ کے بودھ بھکشوؤں سے نہیں مل سکا وہ سائیں سائیں کرتے ریگستان کی اڑتی ہوئی دھول میں دکھائی دے گیا.....؟

کیسا سچ نہالی؟

نہال چند نے سر گھمایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کوئی بات جو برسوں سے ان کے اندر گھٹ رہی تھی۔ جھاڑیوں پر نومبر کی دھوپ پھیل رہی تھی۔ ہوا محل کا گنبد بے حرکت نیلی مٹھی سا، ہوا میں اٹھا تھا۔ نہ کوئی پرندہ، نہ کوئی آواز۔ رتّی کودنے کی آواز بھی نہیں۔ صرف ایک پتھرائی

ہوئی سرد روشنی تھی جو مری ہوئی سفیدی کی طرح سارے جنگل پر پھیلی تھی۔

نہال چند کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ پھر وہ کسی طرح سیدھے کھڑے ہوئے گویا اپنا نہیں کسی اور کا بدن گھسیٹ رہے ہوں۔ پوٹلی اٹیچی تھرمس ... جیبوں میں ٹھنسے ہوئے کاغذ جب نہال چند چلنے لگے تو سب کچھ ان کے پاس تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بھولے تھے۔ ہوا گھر میں کچھ بھی نہیں چھوٹا تھا۔

لوٹنے کا راستہ وہی تھا جس پر وہ چل کر آئے تھے۔ پتھریلی پگڈنڈی، جھاڑ جھنکاڑ، دور دور تک پھیلے مٹی کے ڈھیر جن پر جگہ جگہ پرندوں کا فضلہ تھا نہ جانے کب پیچھے چھوٹ گئے۔ نہال چند کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ کسی خاص فکر میں مبتلا نہیں تھے۔ بس کوئی بھٹکا ہوا خیال ان کے ذہن میں آجاتا اور ان کے دل کو چھوتا ہوا گزر جاتا۔ دیوی سنگھ کا چہرہ، گھر کا کمرہ، جیب میں بھرے کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ ان سب کی چھوٹی چھوٹی پرزیاں ان کے راستے پر اُڑتی رہتیں۔ وہ ایک کو پکڑتے تو دوسری انھیں پکڑ لیتی۔ صبح کی وہ یکسوئی اب ختم ہو چکی تھی جب وہ آنکھیں موندے ہوا گھر کی طرف جا رہے تھے۔ بس اک بدحواسی کا عالم تھا جس میں آنکھیں کھلی رہتیں اور دکھائی کچھ نہیں دیتا۔

پھر جنگل کا ٹکڑا آیا اور نہال چند کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ دھوپ کی سفیدی سے اتر کر طویل سائے میں چلے آئے ہوں۔ آنکھوں کو راحت ملی۔ پتوں پر پیر آسانی سے پڑ رہے تھے۔ کبھی کسی جھاڑی میں ان کا کوٹ اٹک جاتا تو رک کر کھڑے ہو جاتے۔ بہت سنبھال کر خود کو اس جھاڑی سے آزاد کرتے۔ ایک عجیب سا وہم گزرتا گویا کوئی دبے پاؤں ان کے پیچھے آرہا ہے۔ وہ مُڑ کر پیچھے دیکھتے تو کوئی دکھائی نہ دیتا۔ سر اُٹھائے پیڑ، جھکی ہوئی جھاڑیاں، درمیان میں رقص کرتے ہوئے دھوپ کے دائرے۔ انھیں یہ محسوس ہوتا گویا ایسا کبھی پہلے بھی ہوا ہے.... برسوں پہلے جب وہ ان کے پیچھے غائب ہو جاتی تھی اور وہ اپنے گھر کے باغ میں اکیلے چکر لگاتے تھے ـــ کٹّو؛ وہ آواز دینے کی کوشش کرتے لیکن کوئی ان کا گلا پکڑ لیتا۔ جانے دو ان کے اندر کا شیطان کہتا۔ تمھارے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ آگے اور آگے..... وہ انھیں گھسیٹتا ہوا یہاں تک لے آیا تھا۔

کیسی زندگی ؟

اوپر ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور ان کے پاؤں اچانک ٹھٹھک گئے۔ سر اُٹھایا تو ایک لمحے کے لیے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دونوں طرف کے پیڑ ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔ پتّوں کے بیچ آسمان کی نیلی قاش چمک اُٹھتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے، پھر خیال ہوا کہ اوپر کی کوئی شاخ ہلی ہے۔ ڈال سے جب کوئی پرندہ اڑتا ہے تو وہ ہلتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسری ڈال بھی تھوڑی سی ہلتی ہے۔ لیکن اوپر کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ اس عجیب سی سرسراہٹ کے بعد سب کچھ پرسکون ہو گیا تھا۔

نہال چند آگے بڑھے تو اُنھیں ایک بار پھر کسی نے روک لیا۔ اس بار کوئی آواز نہیں تھی۔ صرف ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی چیز ڈول رہی تھی۔ انھوں نے اپنے چشمے کو سیدھا کیا جو اوپر دیکھتے رہنے کی وجہ سے نیچے کھسک آیا تھا۔ اس بار ان کی آنکھیں اُٹھیں اور جم کر رہ گئیں۔

وہ برگد کا چھتنار درخت تھا۔ اس کی شاخ ایک بوڑھے بازو کی طرح مڑی ہوئی نیچے کی طرف جھکی تھی اور اس کے کنارے پر ایک رسی لٹکی ہوئی دھیرے دھیرے ہوا میں جھول رہی تھی۔ جیسے کوئی سانپ بین سنتے وقت پھن ہلاتا ہے۔ انھیں کچھ تعجب ہوا کہ رسی کو پیڑ سے باندھا کیوں نہیں گیا۔ صرف ٹہنی پر کیوں پھینک دیا گیا کہ وہ وہاں اٹک گئی۔ بیچ میں لٹکی ہوئی دونوں سروں کو ہوا میں جھلاتی ہوئی، رسی کے دونوں سروں پر ننھے مہندی رنگے ہاتھوں کی طرح لکڑی کے دو بیلن بندھے تھے۔ جو دھول پسینے اور ہتھیلیوں کی رگڑ سے گھس گئے تھے۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک نہال چند اسے دیکھتے رہے جیسے وہ رسی نہ ہو کوئی طلسمی شے ہو، کوئی مایا جال، نومبر کی دھوپ میں نظر آنے والا سراب۔ ہوا ٹھہر گئی تھی۔ سارا جنگل اپنے اندر سانس لیتا ہوا ایک گھونسلے کی صورت سمٹ گیا تھا۔ وہ سر اُٹھائے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ کوئی انھیں دیکھتا تو اسے گمان گزرتا کہ وہ آدمی نہیں بلکہ جنگل ہی کا کوئی بوڑھا، طویل القامت جانور ہے جو کوئی غیر مانوس آہٹ سن کر بیچ پگڈنڈی پر آ کھڑا ہوا ہے۔ ان کا قد اتنا لمبا تھا کہ ذرا سا ہاتھ اُٹھا کر بھی وہ رسّی کو چھو سکتے تھے۔ اسے پکڑ کر نیچے کھینچ سکتے تھے لیکن وہ جنبش کیے بغیر کھڑے رہے۔ کنٹو۔ وہ دھیرے سے بدبدائے۔ پھر آواز کچھ بلند ہوئی۔ سینے میں پھنسی ہوئی گویا باہر نکلنے کو چھٹپٹا رہی ہو۔ کچھ دیر تک مسلسل سناٹا چھایا رہا..... پھر اچانک انھیں اپنی چیخ

سنائی دی جو نہ جانے کیسے بلند ہو گئی تھی۔ اس بار کسی نے ان کو نہیں روکا نہ گلا دبا کر انھیں چپ کرایا اور وہ جنگل کے آر پار، جھاڑیوں اور پیڑوں کے بیچ، بچپن کے ایک سرے سے بڑھاپے کے دوسرے سرے تک گونجتی ہوئی اپنی آواز کو سنتے رہے .....

کوئی جواب نہیں ملا۔ آس پاس کہیں کوئی نہ تھا۔ ہوا چل رہی تھی اور پیڑ ہل رہے تھے .... رسّی کے دونوں سرے جھول رہے تھے کچھ دیر تک وہ اس اُمید میں کھڑے رہے کہ وہ جھاڑیوں کے بیچ اچانک نمودار ہو گی، اپنی رسی لینے دوبارہ لوٹ آئے گی ..... لیکن بہت دیر تک کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نہ اس کی ہنسی نہ جھاڑیوں کی سرسراہٹ۔ کچھ بھی ایسا نہ تھا جو انھیں یقین دلا سکتا کہ وہ اس دوپہر میں ان کے پاس آئی تھی، ان سے لگ کر بیٹھی تھی، جب وہ سو رہے تھے اور ان کے کاغذ باہر بکھرے تھے تو اس نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی تھی۔

نہال چند کیا تم سچ مچ جاگے ہوئے تھے؟

اندھیرا ہوتے ہی ہوا رک گئی۔ کسی چیز میں بھی جنبش نہیں تھی۔ نہ جھاڑی، نہ پتے، نہ پیڑ، کبھی کبھی جنگل کے اندر سے ایک طویل گرم سانس سی نکلتی جو سیٹی سی بجاتی ہوئی اوپر اُٹھ جاتی۔ دھوبی گھاٹ کے اوپر .... اور کتوں کو چونکاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی، گندے نالے پر اتر جاتی اور دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی نہال چند کے گھر کے پھاٹک پر آ کر رک جاتی تھی۔

دیوی سنگھ اسے اونگھتے ہوئے سنتا رہتا اور رہ رہ کر ہڑک جاتا۔ وہ پہاڑی تھا اور بچپن سے اس طرح کی تاریک اور بے جان آوازوں کو سنتا آیا تھا۔ جو آوازیں نہیں تھیں۔ بس جنگل کے سینے کی بے زبان ہوسناکیاں جو جانوروں اور درختوں کی کراہوں میں سسکتی رہتی تھیں۔ وہ بار بار دروازے کی طرف بھاگتا، باہر جھانکتا، پھر اسی طرح بھاگتا ہوا باورچی خانے میں لوٹ آتا۔

اس رات وہ باورچی خانے ہی میں لیٹا تھا۔ رات کا کھانا دوبار گرم ہو کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کرنل صاحب صبح کی سیر کو نکلیں اور دوپہر تک گھر نہ لوٹیں۔ دیر ہو جاتی تب بھی اندھیرا ہونے سے پہلے ضرور لوٹ آتے تھے۔ سیڑھیوں پر چھڑی کی کھٹکھٹاہٹ سے ہی دیوی سنگھ سمجھ لیتا کہ وہ لوٹ آئے ہیں۔ کبھی کبھی غصّے کے عالم میں وہ باورچی خانے ہی میں لیٹا رہتا گویا اس نے ان کی آہٹ سنی ہی نہ ہو۔ ایسے موقعوں پر نہال چند اسے بلاتے نہ تھے بلکہ اس کی آنکھیں بچا کر

دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلے جاتے اور بستر پر دراز ہو جاتے۔ اس وقت دیوی سنگھ کا دل اُلٹنے لگتا۔ وہ جلدی سے چائے بنا کر ان کے کمرے میں لے جاتا اور وہ نیند کا بہانہ بنا کر آنکھیں بند کئے پڑے رہتے۔ گویا اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

لیکن اس رات ان کا کمرہ خالی تھا۔ پلنگ کے نیچے ان کی چپلیں پڑی تھیں۔ کوتے میں سلیفچی اور گرم پانی کا جگ رکھا تھا جس کا پانی اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ دیوی سنگھ نے کمرے کی انگیٹھی میں آگ دہکا دی تاکہ جب وہ آئیں تو اسے پریشان نہ کریں اور کھانا کھا کر فوراً سو جائیں۔ خود اس کی آنکھیں بوجھل ہو چلی تھیں۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ پڑوس کے مکان میں یہ بتا آئے کہ کرنل صاحب ابھی تک نہیں لوٹے ہیں لیکن پھر قدم رک گئے۔ شہر میں چھوٹی سے چھوٹی بات پر پولس آجاتی ہے۔ پولس کا خیال آتے ہی دیوی سنگھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ چُپ رہنا ہی بہتر تھا۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر میں آتے ہی ہوں گے۔ اکیلے آدمی جائیں گے بھی کہاں اور وہ بھی اس عمر میں ؟

اسے اس بات کی طرف سے پورا اطمینان تھا کہ نہال چند کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ سال میں تین سو پینسٹھ بار عمر کے آخری دن تک بلا ناغہ ہر دوپہر میں وہ صرف گھر ہی لوٹ سکتے تھے۔

دھیرے سے کچھ کھڑکا تو وہ چونکا۔ کیا دروازہ پر دستک ہوئی ہے یا صرف ہوا ہے۔ دیوی سنگھ کچھ دیر اندھیرے میں بیٹھا رہا پھر دبے پاؤں نہال چند کے کمرے میں گیا۔ آگ میں جلتی ہوئی لکڑیاں کڑک اٹھی تھیں۔ جن کی آواز نے اسے جگا دیا تھا۔ انگیٹھی کے پاس رکھی لوہے کی سلاخ سے اس نے نیچے دبی لکڑیوں کو کرید کر اوپر کیا اور جب وہ بھبک کر دوبارہ جلنے لگیں تو وہیں نہال چند کے پلنگ کے نیچے لیٹ گیا۔ آگ کی اُٹھتی ہوئی لپٹوں نے جانے کب اس کو نیند کی آغوش میں لے لیا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ دروازے کی سٹکنی کھول کر باہر چلا آیا اور اسی راستے پر چلنے لگا جس پر ہر روز نہال چند سیر کے لیے جاتے تھے، گندا نالا، دھوبی گھاٹ کا میدان، نہر کی چمکیلی تنگ لہر…

پیڑوں کے اوپر چاند نکل آیا تھا اور سارا جنگل ایک انوکھی روشنی سے چمک رہا تھا۔ کچھ دور پر دونوں ہاتھوں کو ہوا میں ہلاتے ہوئے وہ دکھائی دیے۔ دیوی سنگھ کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ اسے کچھ عجیب سا لگا۔ کرنل صاحب کا وہی چہرہ تھا، وہی جسم، وہی کپڑے لیکن اس وقت وہ چودہ برس کا ایک نو عمر لڑکا معلوم ہو رہے تھے۔ صاف، کنوارا، بے تاب چہرہ۔ وہ دونوں ہاتھ

ہوائیں ہلا کر اسے بلا رہے تھے۔ وہ ڈرے بغیر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ بالکل ان کے قریب چلا آیا اور وہیں کھڑا ہو گیا جہاں وہ پیڑ کے نیچے جھول رہے تھے۔

نہال چند کے گلے میں رسّی پھنسی تھی اور رسّی کا سرا پیڑ کی ٹہنی سے بندھا تھا۔ ٹہنی ہل رہی تھی اور نہال چند لٹک رہے تھے۔ نیچے گھاس پر ان کا تھرمس، تھیلا اور فوجی کوٹ پڑا تھا جس کی دونوں جیبیں اُڑسی ہوئی تھیں۔ بالکل خالی۔ کھٹ... کھٹ.. کھٹ اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ سر اُٹھایا تو بچوں کے کودنے والی رسّی دکھائی دی، چاندنی میں ہلتے ہوئے دو ننھے زرد بیلن جو ٹہنی کے ہلنے سے بار بار نہال چند کے جھولتے ہوئے سر سے ٹکرا جاتے تھے۔

آدمی اور لڑکی

اُس نے دوکان کا دروازہ کھولا تو گھنٹی کی آواز ہوئی۔ ٹن..... جب وہ اندر آیا اور خود کار دروازہ بند ہو گیا تو گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ دو بار — ٹن — ٹن.....

اس بار آواز کافی دیر تک گونجتی رہی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ کوئی اندر آیا ہے۔

دوکان میں کوئی نہیں تھا اسے ہمیشہ محسوس ہوتا کہ اگر وہ شیلف سے دو چار کتابیں نکال کر بھاگ جائے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ گھنٹی بجتے ہی کاؤنٹر کے پیچھے سے دو آنکھیں اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں اور اسے خبر تک نہ ہو پاتی۔ نیلی اور نم آنکھیں، عینک کے پیچھے دو قطرے انھیں روشن کر رہے تھے۔

وہ کتابوں کی الماریوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا کاؤنٹر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا حال ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ادھیڑ عمر کے منیجر نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کندھے اچکائے جس سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس موڈ میں ہے۔

سردی شروع ہو گئی ہے۔ اس نے کہا۔ موسم کا خیال اچانک اسے منیجر کی مونچھیں دیکھ کر آ گیا تھا جو اتنی سفید تھیں جیسے ابھی ابھی ان پر تازہ برف گری ہو۔

"ہو گی ہی۔" بوڑھے نے کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر کہا۔ اکتوبر کا مہینہ ہے۔

"ابھی ہیٹنگ شروع نہیں ہوئی۔"

"نومبر سے پہلے نہیں، چاہے برف ہی کیوں نہ گرنے لگے۔ بوڑھا حکومت پر بہت تیکھے انداز

میں طنز کرتا تھا۔ برسوں پہلے دوکان کا مالک وہ تھا اب نئے نظام میں سرکار دوکان کی مالک تھی اور ان کتابوں کی بھی جو اس کے باپ دادا نے پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں جمع کی تھیں۔ دوکان وہی تھی لیکن راتوں رات قانون نے اس کے اور باپ دادا کی وراثت کے درمیان خلیج پیدا کر دی تھی۔ کاؤنٹر پر وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح بیٹھتا تھا لیکن اب کتابوں سے اس کا رشتہ ویسا ہی تھا جیسے کوئی باپ، اپنی زندگی ہی میں اپنے بچّوں کو یتیم خانے میں پلتے ہوئے دیکھے۔

"آپ کیا سوچتے ہیں برف گرے گی؟" آدمی نے پوچھا۔ بوڑھے نے عینک اتاری۔ میلے رومال سے اس کے شیشے صاف کئے پھر ناک چھنکی۔

"برف اور موت گھنٹی بجا کر نہیں آتے۔"

اسے محسوس ہوا جیسے بوڑھے کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔ پچھلے دنوں جب کبھی وہ دوکان کی گھنٹی بجاتا تھا تو بوڑھے کے چہرے پر ایک اضطراب آمیز جھنجلاہٹ جھلکنے لگتی تھی۔ وہ صاف صاف کچھ نہ کہتا لیکن صاف معلوم ہوتا کہ اسے سامنے دیکھ کر گذشتہ زندگی کی ساری شکایتوں کا دفتر کھل گیا ہو۔ پہلے جنگِ عظیم پھر ہٹلر پھر کمیونزم اور اب .... خود وہ۔

وہ آیا اور الماریوں کے بیچ گھومنے لگا۔ کتابوں پر دوپہر کی ٹھنڈی روشنی گر رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف ٹٹولتی ہوئی نگاہ ڈالی لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ اچانک ایک اندیشے نے اسے گھیر لیا۔ ممکن ہے وہ آج دوکان نہ آئی ہو۔ یہ سوچتے ہی وہ ٹھٹھرنے لگا۔ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، تار والے کاغذ کو چھوا پھر اسے ایک جھٹکے کے ساتھ باہر کھینچ لیا۔ گرمی کہیں نہیں تھی۔ نہ کوٹ کے اندر نہ باہر۔

وہ اب بھی جھجھک رہا تھا۔ لیکن بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک لمبے شیلف کی آڑ میں چھپ گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھے کا پسینہ پوچھنے لگا۔ سردی کا پسینہ جو جسم کے مساموں سے نہیں باہر کی دہشت سے ٹپکتا ہے۔

وہ جھٹ سے مڑ گیا۔ ٹرالی کے پہیے چوں چوں کرتے ہوئے شیلف کی دوسری طرف جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے وہ آ رہی تھی ٹرالی کے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے۔ جیسے وہ کوئی چھوٹا سا پالنا ہو جس میں بچے کی جگہ بہت سی کتابیں بیٹھی ہوں۔

لڑکی کا سر ٹرالی پر جھکا ہوا تھا وہ ایک ایک کتاب اُٹھا کر شیلف میں رکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں شاید بچپن ہی سے کمزور رہی ہوں گی۔ وہ ہر کتاب کو اُٹھاتی اسے اپنی عینک کے بہت قریب لے جاتی۔ مصنّف اور کتاب کا نام پڑھتی پھر کپڑے سے اسے جھاڑ پونچھ کر دوسری کتابوں کے پہلو میں رکھ دیتی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ شیلف کی دوسری طرف سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ چھت پر سے لٹکے قمقموں کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ ایک پستہ قد لڑکی تھی لیکن شیلف کے پیچھے کمر سے اوپر صرف اس کا دھڑ دکھائی دیتا تھا جو اس کی ٹانگوں سے کہیں زیادہ دلاویز تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک لمبا ایپرن پہن رکھا تھا جو دوکان میں کام کرنے والی لڑکیاں پہنتی تھیں۔ لیکن اس کے اوپر وہ زیادہ جچتا نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں وہ پوری ڈھک جاتی تھی اور اس وقت یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کتنی چھوٹی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ اس کی بیسویں سال گرہ پر اس کے لیے پھول لایا تھا جو شاید اس وقت بھی اس کے کمرے میں پڑے سوکھ رہے ہوں گے۔

اب وہ سرکتے ہوئے بالکل اس کے پاس چلی آئی تھی۔ قریب قریب اس کے بالکل سامنے شیلف کی تنگ درازوں کے بیچ اس کا سر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے بال کس کر باندھ رکھے تھے۔ سنہرے چمکیلے بال، جن کے بیچ ایک باریک سی مانگ کچھ دور کھنچ کر اس کی الجھی ہوئی لٹوں میں غائب ہو گئی تھی۔

اس بار وہ خود کو نہیں روک سکا۔ جب لڑکی نے شیلف پر آخری کتاب رکھنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو اس نے آگے بڑھ کر وہیں شیلف کے ٹھنڈے لوہے پر اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ لڑکی کے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے کتابوں کو ہٹا کر شیلف کے بیچ اپنا سر چھپا لیا۔

”میں ہوں۔“

”تم؟“

”ہاں۔“

"کب آئے؟

"کچھ دیر پہلے...... تم ڈر گئیں؟"

"ہاں......" لڑکی نے سر ہلایا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی آدمی کی مٹھی میں دبا تھا۔ ایپرن کے اندر چھوٹا سا جسم اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ سچ مچ ڈر گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ دوپہر کے وقت نہیں آتا تھا۔

"تم کچھ دیر کے لیے چھٹی لے سکتی ہو؟"

"ابھی؟ لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں سرد سا پڑ گیا۔"

"بس تھوڑی دیر کے لیے۔" اس نے کہا۔

"کوئی خاص بات؟" لڑکی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"نہیں۔ یوں ہی" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔ جس طرح لڑکی کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی، اسی طرح وہ کبھی براہِ راست سچ نہیں بولتا تھا۔

"تم اندر بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف مڑ کر کتابوں کی شیلف کے پیچھے چھپ گئی۔

دکان کے عقب میں ایک اسٹور روم تھا جہاں لوگ پرانی کتابیں بیچنے آتے تھے۔ لڑکی وہیں ایک اسٹول پر بیٹھی تھی۔ پیچھے ایک پردہ تھا جو دکان کے اگلے اور خصوصی حصے کو اندرونی حصے سے الگ کر دیتا تھا۔ پردے کے پیچھے ایک چھوٹا سا کیبن تھا جہاں لڑکی لنچ کے وقت گھڑی دو گھڑی آرام کرنے کی غرض سے آ بیٹھتی تھی۔

وہ یہیں چلا آیا۔ یہاں وہ کئی بار آیا تھا۔ ہر بار اسے ایک عجیب سا وہم گھیر لیتا کہ جیسے یہ دکان نہ ہو بلکہ لڑکی کے گھر کا نجی کمرہ ہو۔ وہاں باہر کی کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ نہ آدمیوں کا شور نہ ٹریفک کا غل۔ صرف ٹرام کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ بہت گمبھیر اور دھیمی۔ جیسے دور کہیں شہر کے کنارے پر بادل گرج رہا ہو۔

وہ بید کی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں روشنی جتنی کم تھی اندھیرا اس قدر نہیں تھا۔ یہاں

کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان صرف سیلی ہوئی کتابوں کی بو اور چوہوں کی سرسراہٹ۔ ایک چھوٹی سی میز پر چائے اور کافی کا سامان رکھا تھا۔ پرانے سلامی بسکٹ اور براؤن روٹی کے توس ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جب کبھی لڑکی کو بھوک لگتی تو وہ جلدی سے اندر آکر کچھ نہ کچھ اپنے پیٹ میں ڈال لیتی۔

پہلی بار اس نے لڑکی کو اسی کیبن میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کچھ پرانی کتابیں بیچنے آیا تھا۔ لڑکی کاؤنٹر کے پیچھے اسٹول پر بیٹھی ایک توس کتر رہی تھی۔ اس کی گود میں کتھئی رنگ کا آدھا بنا ہوا سوئٹر پڑا تھا جس کے پھندوں میں دو سلائیاں پھنسی تھیں۔ اس کی آہٹ سن کر لڑکی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس دن پہلی بار اس نے لڑکی کے چہرے کو دیکھا تھا۔

وہ مارچ کا کوئی دن رہا ہوگا اور اب اکتوبر ختم ہو رہا تھا۔ ان سات مہینوں میں وہ تقریباً اپنی ساری کتابیں بیچ چکا تھا۔ ان کتابوں کو وہ اپنے ملک نہیں لے جانا چاہتا تھا ان میں پرانے لغت تھے، ٹورسٹ گائیڈس اور وہ ناول جنہیں لڑکی دکان کے لیے خرید لیتی تھی اور خالی وقت میں ان کا مطالعہ کرتی تھی۔ اسے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا تھا کہ وہ انگریزی پڑھ لیتی ہے اور تھوڑی بہت بول بھی لیتی ہے۔ دراصل انگریزی ہی کی وجہ سے ان کے درمیان بول چال کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ایک دن جب وہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے آیا تو وہ کچھ دیر تک انھیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اچانک بولی ”کیا آپ کے ملک میں سب لوگ انگریزی بولتے ہیں؟“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں بھی ٹھیک سے نہیں بول پاتا۔“

”آپ بہت اچھی بولتے ہیں۔“ اس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ پھر اس کی طرف سے آنکھیں پھیر کر کتابوں کو سمیٹنے لگی۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔“ اس نے کتابوں کا بنڈل اٹھایا اور پردے کے پیچھے چلی گئی۔

وہ سوچنے لگا پتہ نہیں آج کتنی کتابیں منتخب کی جائیں۔ وہاں کچھ ایسا ہی طریقہ تھا۔ لڑکی کتابوں کو منیجر کے پاس لے جاتی وہ ان میں سے ان کتابوں کو منتخب کر لیتا جو خریدے جانے کے لائق ہوتیں۔ باقی واپس کر دیتا۔ ساری تجارت جوئے کے کھیل کی طرح تھی۔ کتابوں کو منتخب کرنے اور انھیں مسترد کرنے کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی رہی ہو یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا جب

کبھی وہ لڑکی سے اس طریقۂ کار کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ اور جب وہ (بعد کے دنوں میں) بہت زور دے کر پوچھتا تو وہ جھنجھلا کر کہتی ”ہم وہی کتابیں پڑھتے ہیں جنھیں اپنے لیے ٹھیک سمجھتے ہیں۔“

اسے اس کی خوش نصیبی کہیے کہ اس دن ساری کتابیں ٹھیک نکلیں سوا ایک کتاب کے جسے منیجر نے واپس بھجوا دیا۔ ”ریم بیئم فار دی نن“ لڑکی نے حیرت اور تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا یہ مذہبی کتاب ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ایک طوائف کے بارے میں ہے۔“

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ مذہب اور عیاشی دونوں ہی وہاں ممنوع تھے۔ لیکن لڑکی کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا۔ اس نے چرمی پیپر بیک کو ڈھیر سے کاؤنٹر کے نیچے سرکا دیا۔ اسے چھپانا بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کاؤنٹر کے نیچے والی دراز اس کی اپنی دراز تھی۔ جس میں وہ اپنا ناشتے دان، رومال، تولیہ اور گھر کی چابیاں رکھتی تھی۔

پتہ نہیں اس کی کتنی کتابیں اس کاؤنٹر کے اندر غائب ہو چکی تھیں۔

”آج آپ کو کافی پیسے ملیں گے۔“

اس نے سرسری نظر سے بل کو دیکھا جو کھٹ کھٹ کرتا ہوا کمپیوٹر مشین سے باہر نکل آیا تھا اس کا جی چاہا کہ ایک بار جھانک کر بل کو دیکھ لے لیکن ایسا کرنے سے اس نے خود کو باز رکھا۔ اگر کمرے کا چوتھائی کرایہ بھی نکل آئے تو باقی رقم کا انتظام کرنے میں اسے زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔

معلوم ہے کتنا ہے۔ لڑکی نے بل کو مشین سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”چالیس کراؤن۔“ سن کر اسے فوراً یقین نہیں آیا۔ اس سے پہلے اپنی کتابوں کے لیے کبھی اسے اتنی بڑی رقم نہیں ملی تھی۔ لڑکی اس کی طرف دیکھ کر فاتحانہ شان سے مسکرا رہی تھی۔

”اتنا کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”ایسے ہی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اچھے دن ہیں۔“

”اچھے دن؟“ دکان کے اندر لڑکی کی زبان موہن جو داڑو کی تحریر جیسی ہوتی تھی جس کے پوشیدہ معنی تو بہت کچھ ہوتے ہیں لیکن جو بظاہر بے معنی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بے خوابی کے

عالم میں بستر پر پڑے پڑے ایک جملہ یا کوئی لفظ لڑکی کے تصور کے ساتھ اندھیرے میں چمک اٹھتا۔ اچھے دن؛ برے دن؛ بہت برے دن۔ سب سے برے دن وہ ہوتے جب لڑکی اس کی ساری کتابیں واپس کر دیتی۔ پر تاسف نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہتی۔ "آج کچھ بھی نہیں۔۔۔" اور وہ ساری کتابیں اپنے تھیلے میں ڈال کر باہر سڑک پر آجاتا۔ دکان کی لمبی شیشے والی کھڑکی پر ایک سایہ پڑتا۔ وہ دیکھتی کہ وہ جا رہا ہے اور وہ سوچتا کہ اگلی مرتبہ وہ کون سی کتابیں لائے گا جو خریدے جانے کے لائق ہوں لڑکی سوچتی کہ کیسا آدمی ہے جو صرف انگریزی کتابوں کا سودا کرنے آتا ہے۔

منیجر سب کچھ دیکھتا رہتا اور اونگھتا رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ آدمی کتابوں کے لیے نہیں بلکہ لڑکی سے ملنے آتا ہے۔۔۔۔ لیکن اس عمر میں۔۔؟

لڑکی اندر آگئی۔ وہ اپنا ناشتے دان لے کر آئی تھی۔ آتے ہی دہلیز پر ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔ آدمی کرسی پر سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تکان تھی گویا اس کی نیند کا فائدہ اٹھا کر نہ صرف گزرے ہوئے برس بلکہ آنے والے سال بھی اس کے چہرے پر سرک آئے ہوں۔ لڑکی کچھ دیر چپ چاپ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ کوئی اور دن ہوتا تو آدمی کا اس طرح اچانک دکان میں وارد ہونا اسے اچھا لگتا۔ لیکن آج اسے یہ بدشگونی سی معلوم ہوئی۔ اسے جنوں، بھوتوں پر یقین نہیں تھا لیکن آج جب اس نے آدمی کو کتابوں کی شیلف کے پیچھے دیکھا تو پرانے اوورکوٹ کے گرد آلود کالر سیاہ ناگنوں کی طرح اس کی گردن پر اٹھے ہوئے تھے تو وہ مبہوت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ جیسے آدمی کے بھیس میں کوئی دوسرا آدمی اسے تاک رہا ہو، دوسرا آدمی؛ وہ دھیرے سے آگے بڑھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرے لیکن پھر اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ "سونے دو" اس نے سوچا۔ ابھی کافی وقت ہے۔

دوپہر کے وقت کوئی گاہک نہیں آتا تھا۔

وہ اپنا ناشتے دان کھولنے لگی۔ براؤن روٹی کی سینڈوچ جس کے اندر سلابی دبی تھی۔ ایک چھوٹی بوتل میں یورگرٹ کے کیوب، سرکے میں بھیگا کھیرا۔ یہی اس کا لنچ تھا۔ جسے ہر روز وہ اپنے ساتھ لاتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ بھی آنے والا ہے تو وہ اس کے لیے بھی کچھ لے آتی۔

اس نے کتنی بار آدمی سے کہا تھا کہ اسے گھر میں کھانا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ ایک ساتھ دکان میں کھا سکتے ہیں لیکن آدمی ہر بار انکار کر دیتا تھا۔ جیسے دن کی روشنی میں لڑکی سے ملنا خطرناک ہو۔ دن کے وقت وہ لڑکی سے اسی صورت میں ملتا تھا جب اسے کوئی ایسی ضرورت ہو جسے ٹالا نہ جا سکتا ہو۔ لیکن آج؟ آج کیا ضرورت ہے؟ وہ کل رات ہی تو اس سے ملی تھی۔

وہ کافی کے لیے پانی گرم کرنے اُٹھی تو دیکھا کہ آدمی کی آنکھیں کھلی ہیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر سے وہ اس کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کچھ کھاؤ گے؟" لڑکی نے پوچھا۔

آدمی نے سر ہلایا۔ پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ داڑھی بنی ہوئی تھی لیکن گزری ہوئی رات کا سایہ اس کے گالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور بالوں کو پیچھے کی طرف کر لیا۔ اسے یاد نہ آیا کہ وہ کب سو گیا تھا۔ خواب کی ایک لکیر اب بھی کھنچی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ بھی غائب ہو گئی۔ اور اس کی جگہ لڑکی دکھائی دینے لگی۔

لڑکی نے اپنا اپرن اُتار دیا تھا اب وہ ہرے رنگ کی اسکرٹ میں تھی جو ہمیشہ اس کے گھٹنوں تک آ کر رک جاتی تھی۔ سیاہ نائلون کے موزوں کے اندر سے اس کی ٹانگوں کی نرمی جھانک رہی تھی۔ کمر میں کالے رنگ کی پیٹی کسی تھی۔ بالکل اسکولی لڑکیوں کی طرح۔ اور اس کے اوپر ڈھیلا ڈھالا کارڈیگن لٹک رہا تھا۔ لڑکی کا چہرہ تو چھپا رہتا تھا لیکن جسم ہمیشہ کھلا اور اجلا دکھائی دیتا تھا۔ دوسری لڑکیوں کے بالکل برعکس جن کا چہرہ تو سب کو نظر آتا لیکن جن کا جسم کوئی نہ دیکھ پاتا۔

پانی کھولنے لگا تھا۔ جیسے ہی بھاپ نکلنا شروع ہوئی لڑکی کافی بنانے کے لئے جھک گئی۔ اس نے دو مگوں میں کافی ڈالی اور جب مُنھ اُٹھایا تو اس کے ہونٹ کُھل سے گئے۔ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر چمک رہے تھے۔

"گھر سے آ رہے ہو؟"

آدمی تھوڑا سا جھجکا۔ وہ گھر ہی سے آ رہا تھا۔ لیکن سیدھا گھر سے نہیں۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا اور جیب ہی میں پڑا رہا۔ اس میں رکھے ہوئے ٹیلی گرام پر۔

"انسٹی ٹیوٹ گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"پورا کرلیا؟" لڑکی ہمیشہ یہی ایک سوال پوچھتی تھی۔

"نہیں۔ پیشگی مانگنے گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"کتنے صفحے رہ گئے ہیں؟"

"آخری باب بچا ہے۔ باقی سب ٹائپ کرنا ہے۔"

"کیا وہ ٹائپ بھی نہیں کروا سکتے؟" لڑکی نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"ایک ہی انگریزی ٹائپسٹ ہے وہ بھی چھٹی پر گیا ہے۔"

آدمی دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ ایک دوسرے کا غم غلط کرنے کا یہی ایک طریقہ بچا تھا۔ وہ کہاں سے کہاں نکل جاتے لیکن لڑکی کا جسم ساکت رہتا۔ ساکت اور ٹھنڈا۔ اور سب سے زیادہ اس کے پاؤں۔ جب وہ اس کے کمرے میں آتی تو سب سے پہلے اپنے پاؤں آگ کے سامنے پھیلا دیتی تھی۔ آدمی کو بڑا تعجب ہوتا کہ اتنی کم عمر میں لڑکی کے ہاتھ پاؤں اس قدر سن ہو جاتے ہیں۔

"کتنے دن میں دینا ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"دس دن..... زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ کیوں؟"

"کیا میں ٹائپ کر سکتی ہوں؟"

"تم ___؟" آدمی کے چہرے پر تھکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"کیوں نہیں..... ہر شام کروں گی۔"

لڑکی نے حال ہی میں انگریزی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنا سیکھا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک مشغلہ تھا۔ آدمی جتنا بھی ترجمہ کرتا اسے بولتا جاتا اور لڑکی کی انگلیاں تیزی سے ٹائپ رائٹر پر چلتی رہتیں اور اس میں سے انگریزی کے الفاظ نکلتے جاتے۔ پھر دونوں بیٹھ کر تصحیح کرتے آدمی کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ انگریزی زبان اور ٹائپنگ دونوں ایک ساتھ سیکھ جائے گی لیکن اسے سیکھنے کی خواہش نہیں تھی۔ اُسے اس کام میں سکون ملتا تھا۔ رات کا یہی ایک لمحہ ہوتا جب وہ آدمی کے پاس ہوتی تھی۔ کھڑکی کے باہر تارے نظر آتے۔ ٹائپ رائٹر کے حروف کی طرح

ٹمٹماتے ہوئے۔ کھٹ .... کھٹ .... کھٹ .... وہ ان حروف پر انگلیاں رکھتی جاتی اور حرف آسمان سے اتر کر سفید فل اسکیپ کاغذ پر پھیلتے جاتے۔

کیتلی کا پانی سن سنا رہا تھا لڑکی نے سوئچ بند کر دیا اور اوپر کا روشن دان کھول دیا تاکہ اس بار بھاپ باہر نکل سکے۔

"یہ گرم ہے ...." لڑکی نے دوسری پیالی بنانے کے لئے سر جھکایا تو اس کا جوڑا کھل کر اس کے شانے پر بکھر گیا۔ لڑکی کے جسم پر ایسے کئی چھوٹے چھوٹے حادثے رونما ہوتے رہتے تھے اور وہ ان سے بے خبر رہتی تھی۔ مثلاً جب وہ کوئی پرانی کتاب بیچنے آتا تو وہ انگلی میں تھوک لگا کر اس کے صفحے پلٹتی تھی اور ہونٹ ہلا ہلا کر اُنھیں پڑھتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اُسے بہت غور سے دیکھتا تھا۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کے جسم کو وہ گذشتہ راتوں میں چھوتا رہا ہے۔ اور جو دن میں اتنی اچھوتی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے لمحوں میں اسے محسوس ہوتا کہ وہ نیچے کہیں کسی گڑھے میں ایک جانور کی طرح دبکا ہوا ایک ہی خواہش کے تلے بار بار پس رہا ہے کہ جتنی دیر تک لڑکی اس کی طرف سے بے خبر کافی بنانے میں مصروف ہے وہ اُچھل کر اس گڑھے سے نکل سکتا ہے اور اس کی سفید اور کنواری گردن کو دبوچ کر ایک جست میں دکان سے باہر جا سکتا ہے۔ دکان سے، پچھتاوے سے، گناہ سے، سب سے باہر لیکن جب وہ نگاہیں اوپر اُٹھاتی تو اس کے سب ارادے دھرے رہ جاتے۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہتا۔ لڑکی پتہ نہیں کس خیال میں کھو کر مسکرانے لگتی۔ وہ اپنے غصّے، اپنی اذیت اور اپنے دل کی دلدل میں دھنسا رہتا۔

وہ نیچے تپائی کی طرف جہاں لڑکی کیتلی ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، اس طرح جھکا جیسے اسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا ہو۔ "کل رات تار آیا تھا"

"ٹیلی گرام؟" لڑکی کے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور کافی کا مگ ہوا میں ہلکا سا ٹھہر گیا۔

"وہ بیمار ہے" آدمی نے کہا۔ مجھے بلایا ہے۔

اس نے تار جیب سے باہر نکالا۔ لال کاغذ کی مڑی ہوئی قابلِ رحم پرچیاں جسے لڑکی نے دیکھتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔

"کیا بیماری ہے؟" اس نے بے پروائی سے پوچھا۔

”وہیں جاکر معلوم ہوگا۔“ آدمی نے کہا۔

”کب؟“

وہ چُپ بیٹھا رہا اور میز پر پڑے تار کو دیکھتا رہا۔

”کب جارہے ہو؟“ لڑکی نے دوبارہ پوچھا۔ لیکن اب اس کے لہجے میں سرد مہری کے بجائے عجیب سی نرمی تھی۔

”خط کا انتظار ہے۔“ اس نے کہا۔

”لیکن اگر وہ واقعی بیمار ہے؟“ لڑکی نے کہا۔

”واقعی کا مطلب؟ تم سوچتی ہو یہ بہانہ ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ لڑکی بولی۔ اگر وہ بیمار ہے تو تمھیں جانا چاہیے۔

”تمھیں بہت جلدی ہے۔“

”جلدی کیسی۔“

”میرے جانے کی۔“

لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ اس نے کہا۔

”مجھ سے زیادہ تمھیں اس کی فکر ہے۔“

اس کے لہجے میں طنز تھا اور وہ طنز سے بھی آگے جانا چاہتا تھا جہاں سے بے رحمی شروع ہوتی ہے۔ لیکن وہاں صرف کمینگی تھی۔ وہ رک گیا۔ اس کے بعد کچھ نہ تھا صرف ایک غلاظت بھری تکان اور جلن تھی۔ وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔

”میں اب چلتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ٹھہرو۔“ لڑکی نے اس کے گھٹنوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا

”ابھی تم نے کیا کہا تھا۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔“ لڑکی کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ جیسے وہ اس کی سنگ دلی کو ٹھیک سے دیکھ نہ پا رہا ہو۔

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ آدمی نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ لڑکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

”اگر میں کہوں تو تم رک جاؤ گے؟“

"تم نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔"

"بات یہ ہے ...." "کوئی فائدہ نہیں وہ جب جب آدمی کا امتحان لیتی تو آدمی کا چہرہ اس سے دور ہونے لگتا اس کی جگہ اسے اپنا گناہ نظر آنے لگتا۔ جو اس سے اسی طرح کے سوال کرتا جس طرح کے سوال وہ آدمی سے کیا کرتی تھی۔ یہ ایک چکر تھا۔ گناہ کا چکر۔ جس کا کوئی اختتام نہیں تھا۔

"کیا وہ اکثر بیمار رہتی ہے؟" اس نے پوچھا۔ وہ کبھی اس کی بیوی کا نام نہیں لیتی۔ صرف وہ کہہ کر اس کا ذکر کرتی۔ گویا اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک "وہ" اس کی بیوی ہو سکتی ہے۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دوسرے شہر میں تھی اور اس نے وہ شہر بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آدمی چپ چاپ لڑکی کو دیکھتا رہا۔ لڑکی کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے اس طرف... چھتیں جہاں چڑھتی ہوئی دھوپ کے سائے نمودار ہونے لگے تھے۔

"کل رات میں نے ایک خواب دیکھا۔" اس نے کہا۔

"کیا خواب؟"

"میں نے دیکھا کہ تم نیچے کھڑی ہو اور اوپر میرے کمرے کی طرف دیکھ رہی ہو۔ میں تمھیں آواز دے کر بلانا چاہتا تھا لیکن تم مڑ کر چل دیں اور میں نیچے آنے کے لیے زور زور سے دروازہ بھڑبھڑاتا رہا۔

لڑکی ہنسنے لگی۔ "سچ؟"

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی سچ مچ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ سوچا شاید تم ہو۔ لیکن باہر تار والا کھڑا تھا۔

آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن لڑکی کی ہنسی پھیکی پڑ گئی۔ اس نے اس خواب کو بدشگونی سمجھا۔ وہ بدشگونیوں میں گھری رہتی تھی۔ اسی لیے کلیسا میں گھڑی دو گھڑی بیٹھنا اُسے اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یہ بات کبھی آدمی کو نہیں بتائی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ آدمی سے کچھ چھپاتی تھی لیکن خدا پر اپنے یقین کو وہ ایک نجی قسم کی بیماری سمجھتی تھی جس سے وہ آدمی کو دور رکھنا چاہتی تھی۔ خدا کے ارد گرد ویسا ہی اندھیرا تھا جیسا آدمی کی بیوی کے آس پاس اور

وہ اس کی بیوی کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا آدمی اس کے خدا کے بارے میں ... ان دونوں کو اکیلے چھوڑ دینا ہی مناسب تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ وہ لپکتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی، سٹکنی کھول کر باہر جھانکا۔ کوئی گاہک آیا تھا۔ "یہ لنچ کا وقت ہے۔" اس نے کہا اور جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ لیکن مڑی نہیں۔ چوکھٹ پر کھڑی رہی اور بند دروازے کے شیشے سے چڑھا ہوا دن دیکھنے لگی۔ اکتوبر کا دن کہرے کی پرت سے نکل رہا تھا۔ اسے بہت پہلے کے دن یاد آئے جب اس کی ملاقات آدمی سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ دکان سے گھر اکیلی بھی جاتی تھی اور شہر اسے خالی خالی سا لگتا تھا۔

جب وہ آدمی کی طرف مڑی تو مسکرا رہی تھی۔

"کتنی دور ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا ـــ؟" آدمی جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

"تمھاری بیوی کا شہر؟" اس بار اس نے واقعی بیوی کا لفظ استعمال کیا جیسے وہ اس کی دور دراز کی کوئی سہیلی ہو۔

"ایک گھنٹہ لگتا ہے۔" آدمی نے کہا۔ وہ کچھ مصروف سا نظر آنے لگا۔

"کیسے جاؤ گے؟"

"بس سے۔ ہر گھنٹے بعد جاتی ہے۔"

لڑکی آدمی کے پاس آئی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "میں بھی چلوں؟"

"تم ـــ؟"

"بس اسٹینڈ تک چلوں گی۔"

آدمی تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ گہرے سناٹے کے بیچ کھڑی تھی۔ جہاں ایک طرف ٹیلی گرام پڑا تھا اور پیچھے کتابوں کی وہ قطار تھی جس کے اندر موت اور زندگی کا علم بھرا تھا۔ لیکن اس وقت یہ علم نہ اس کی مدد کر سکتا تھا نہ لڑکی کی۔

اس نے تھیلا اٹھایا اور لڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے چھوٹے سے سر پر اپنا

منہ رکھ دیا۔ وہ عمر میں آدمی سے بہت چھوٹی تھی اور ایک اسکولی لڑکی کی طرح گم سم کھڑی تھی۔ اس وقت آدمی کو محسوس ہوا کہ اس کی عمر کے چالیس سال ایک گندے نالے کی طرح دکان کے بیچوں بیچ بہہ رہے ہیں اور نالے کے بیچ میں پانی اتنا کم ہے کہ وہ اس میں ڈوب کر مر بھی نہیں سکتا۔ صرف لڑکی کو اس میں گھسیٹ کر گندا کر سکتا ہے۔

وہ دکان سے باہر نکل آیا۔

لڑکی بھاگ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ آدمی دکان سے نکل کر سڑک پار کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے لمبے شیشے سے اسے چھوٹا ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔

دوسرے دن لڑکی یوں ہی ٹہلتے ہوئے اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ شہر سے باہر ہے اور مکان خالی ہے۔ وہ پچھلی رات کو ہی چلا گیا تھا۔ فلیٹ کی دوسری کنجی اس کے پاس تھی جو ہمیشہ اسی کے پاس رہتی تھی اور وہ کسی بھی وقت اس کے فلیٹ میں جا سکتی تھی۔

لیکن اس شام وہاں کوئی نہ تھا۔ فلیٹ کی سیڑھیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور چوکیدار کا حجرہ خالی پڑا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بجائے وہ چلتی ہوئی پیچھے کی طرف چلی گئی تاکہ ذرا فاصلے سے آدمی کا کمرہ دیکھ سکے جو تیسری منزل پر واقع تھا اور جس کی کھڑکی پارک کی طرف کھلتی تھی۔

پارک میں بچے کھیل رہے تھے۔

کھڑکی بند تھی۔ جانے سے پہلے وہ کھڑکی کے پردے گرانا بھول گیا تھا۔ اس لیے شام کی دھوپ کھڑکی کے شیشوں پر چمک رہی تھی جس کے اندر سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میز پر رکھا ٹائپ رائٹر، دیوار پر ٹنگی قمیض اور کھڑکی کے چھجے پر رکھا وہ گلدان جسے بہت دن پہلے وہ اسی کے لیے لائی تھی۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ اندر جائے۔ فوراً ہی اس کی انگلیاں پرس کے اندر گئیں اور اس میں اٹکی ہوئی چابی سے کھیلنے لگیں۔ لیکن کمرے کے خالی ہونے کا احساس انگلیوں کو بھی ہو گیا تھا۔

وہ مڑی اور آہستہ قدموں سے گھاس پر چلنے لگی۔

پارک کے بیچ انگریزی طرز کا تالاب تھا جس میں بطخیں تیر رہی تھیں۔

وہ سوچ میں ڈوبی تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ لیکن اس کی سوچ کا کوئی ایسا سرا نہیں تھا جسے پکڑ کر وہ اندر کی گرہ کھول سکے۔ ساری سوچ آدمی سے شروع ہوتی تھی اور اس دن سے شروع ہوتی تھی جس دن وہ پہلی بار دکان میں آیا تھا۔ وہ ایک عام سا

دن تھا لیکن اس وقت اسے پتہ بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ رشتہ اتنا انوکھا ہو جائے گا کہ وہ دن رات اس کے بارے میں سوچا کرے گی۔ جب وہ اپنی کتابیں کاؤنٹر پر چھوڑ کر چلا جاتا تو وہ اس کے صفحے اُلٹنے لگتی۔ انگریزی کی پرانی خستہ کتابیں جن پر اس کا نام اس کے شہر کا نام اور وہ تاریخ لکھی رہتی جب اس نے یہ کتابیں خریدی تھیں۔ ان تاریخوں کو دیکھ کر اسے عجیب سی حیرانی ہوتی کہ جب وہ اس دنیا میں آئی بھی نہیں تھی اس وقت وہ اپنے شہر میں گھومتا رہا ہوگا، پڑھتا رہا ہوگا۔ اور جب آدمی کی شادی ہوئی ہوگی اس وقت اس نے اسکول جانا شروع کیا ہوگا... وہ مسکرانے لگی۔ لوگ مجھے اس کی بیٹی سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ دن کی روشنی میں میرے ساتھ چلنے سے کتراتا ہے۔ مجھے کبھی عمر کا خیال نہیں رہتا۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتا ہے تو مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مجھ سے کتنا بڑا ہے۔ عمر کے بارے میں کیا سوچنا — ؛ وہ رات میں گرنے والی برف ہے جس کا سوتے میں پتہ بھی نہیں چلتا اور صبح اُٹھو تو پھاٹک پر ڈھیر سی دکھائی دیتی ہے۔

برف کی بات پر اسے مارچ کا مہینہ یاد آگیا اس شام وہ پہلی بار آدمی کے ساتھ سوئی تھی اس شام سال کی آخری برف گری تھی وہ باہر نکلی تو سارا وجود سُن تھا اور سارا شہر ٹھٹھر رہا تھا۔ آدمی نے اسے بہت روکا لیکن اس کے اندر کچھ جل رہا تھا جو سارے شہر کو سوخت کر سکتا تھا۔ وہ چلتی رہی اور جب اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ اس کلیسا میں چلی گئی جو ویران پڑا رہتا تھا اور جس میں وہ اکثر جایا کرتا تھی اور جس کے بارے میں آدمی کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔

وہ اندر چلی آئی اور سب سے آگے والی بنچ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر قبل وہ آدمی کے بستر میں تھی اور اب یہاں؛ وہاں وہ کیا کر رہی تھی یہ اسے بہت دیر تک نہیں معلوم ہو سکا۔ سامنے سولی پر ایک آدمی ٹنگا تھا۔ جس کے ہاتھ پیر اور سینے میں کیلیں ٹھکی تھیں۔ بہت دیر تک اسے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ اکیلی نہیں ہے کوئی اس کے پاس بیٹھا ہے۔ بالکل اس کے قریب۔ جسے وہ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو اسی کے ساتھ بنچ پر بیٹھی تھی۔ گنگناتی ہوئی، دعا کرتی ہوئی، ہوا میں شمع کی طرح لہراتی ہوئی۔ کیا وہ کچھ مانگ رہی تھی؟ وہ خدا سے کچھ مانگ رہی تھی اور اس وقت یہ سوچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی طویل عمر گزار دینے کے بعد کہ جب کچھ باقی نہیں رہتا، خدا سے کچھ مانگا جا سکتا ہے؛ وہ بوڑھی عورت کے پاس کھسک

آئی۔ "سنو! کیا یہ گناہ ہے؟" اس نے دھیرے سے بوڑھی عورت کے کان میں کہا۔ "اس آدمی کے ساتھ سونا جس کی بیوی زندہ ہے؟"

"کون؟ بوڑھی عورت نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "کون زندہ ہے؟" وہ ہنس رہی تھی۔ اس کے سارے دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے کھلے اور پوپلے مُنہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ شراب، ضعیفی اور آنسوؤں میں لپٹا ہوا اس کا چہرہ اوپر نیچے ہل رہا تھا۔

وہ بھاگ کر باہر چلی آئی۔ بہت دیر تک بڑھیا کا چہرہ اس کا تعاقب کرتا رہا۔ پھر اچانک غائب ہوگیا۔ برف گرنا بند ہو چکی تھی۔ وہ مارچ کا مہینہ تھا جب وہ پہلی بار آدمی کے ساتھ سوئی تھی۔

اب وہ اس کے گھر کے سامنے بیٹھی تھی۔ بچّے اپنے گھروں کو جا چکے تھے اور بطخیں؟ پتہ نہیں کہاں ڈوب گئی تھیں۔ تالاب اندھیرے میں سویا ہوا تھا۔ نہ چھپ چھپ نہ اور کوئی آواز۔ آس پاس کے مکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھی۔ صرف آدمی کا کمرہ تیسری منزل پر تاریک اور ویران پڑا تھا۔ اب وہاں نہ گلدان تھا نہ میز، نہ دیوار پر لٹکی ہوئی قمیض۔

وہ کسی دوسرے شہر میں اپنی بیوی کے ساتھ لیٹا تھا۔ نہ جاگ رہا تھا نہ سو رہا تھا۔ وہ اس دن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سات مہینے قبل وہ لڑکی کی دکان میں گیا تھا۔ بغل میں اس کی بیوی سانسیں لے رہی تھی۔

وہ تین دن بعد لوٹا تھا۔ تین چھوٹے دن اور دو لمبی راتیں جن میں لڑکی گھر سے دکان گئی تھی اور واپس گھر لوٹی تھی۔ اور پھر دکان اور پھر گھر۔ ایک شام وہ بس اسٹیشن پہنچ گئی حالانکہ آدمی کے آنے کا وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ دوسری شام وہ اس کے گھر گئی اور پارک میں کھیلتے ہوئے بچّوں اور تیرتی ہوئی بطخوں کو دیکھتی رہی۔ آدمی اپنی بیوی سے ملنے پہلے بھی جاتا تھا لیکن لڑکی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اس عجیب سی چیز کو دیکھا تھا جو کچھ بھی نہیں تھی۔ کسی کا نہ ہونا۔ یہ بھی کوئی چیز ہے، لیکن جہاں بھی وہ جاتی تھی وہ شے بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتی۔ جب رات کو لیٹتی تو وہ چیز بھی اس کے ساتھ لیٹ جاتی اور جب وہ سونے لگتی تو جاگ کر اس کا سونا دیکھتی۔ اور تب اس کی سمجھ میں آیا کہ تنہا لوگ کلیسا میں، شراب خانوں میں اور ایسے گھروں

میں جاتے ہیں جہاں عورتیں اپنا جسم فروخت کرتی ہیں اور وہ مرد بھی جو اپنی بیویوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حالانکہ ساتھ رہنے کا سکھ کب کا مٹ چکا ہوتا ہے۔

لیکن سکھ لڑکی کو نہیں ستاتا تھا وہ اس کے بارے میں سوچتی بھی نہیں تھی۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا وہ بھی اس چیز کے بارے میں جانتا ہے جسے وہ اس کے پاس چھوڑ جاتا تھا؟ کیا وہ اس چیز کو جانتا تھا؟ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس چیز کو جانتا ہے اور اسی لیے اس سے الگ ہونا چاہتا ہے لیکن الگ ہوتا نہیں تھا۔ ایک عجیب سے غصّے میں تنا رہتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کی بھرائی اور تنی ہوئی آواز فون پر سنائی دیتی تھی۔

اس کا فون لنچ کے وقت تیسرے روز آیا تھا۔ اس وقت منیجر باہر تھا اور وہ اپنے کیبن میں تھی اور ناشتے دان کھول رہی تھی۔ گھنٹی سنائی دی تو اس کے ہاتھ ڈبے پر سے ہٹے نہیں۔ اسی کا فون ہو سکتا ہے، اس نے سوچا۔ حالانکہ فون کی گھنٹی ہمیشہ ایک ہی طرح بجتی تھی۔ وہ الماریوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی کاؤنٹر پر آئی۔ فون اُٹھایا آدمی کی آواز سنی اور جب واپس اپنے کیبن میں آئی تو اسے کھڑکی کے باہر پیڑ نظر آیا۔ سڑک دکھائی دی۔ سامنے کی دیوار کا پوسٹر دکھائی دیا۔ جس کا ایک کونا اکھڑ کر ہوا میں لہرا رہا تھا۔ تین دن بعد وہ اپنے شہر کو نئے سرے سے دیکھ رہی تھی۔

فون کی آواز اب بھی اس کے اندر گونج رہی تھی۔ یاس انگیز ناراضگی میں ڈوبی ہوئی پتہ نہیں وہ کیوں اکڑا ہوا تھا؟ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کے یہ دن کیسے گزرے۔ تین ہی دن اپنی بیوی کے ساتھ رہ کر اس پر اس طرح غصّہ کرنا۔؟ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا؟

اس نے جلدی جلدی ان کتابوں کو تھیلے میں ڈالا جو وہ اس کے لیے جمع کیا کرتی تھی۔ یہ کتابیں صرف اسی کے لیے مخصوص تھیں۔ انھیں نہ کسی کو دکھایا جا سکتا ہے نہ بیچا جا سکتا تھا۔ یہ کتابیں گودام میں پڑی سڑا کرتیں۔ انھیں وہ اپنے پیسوں سے خریدا کرتی تھی اور گودام کے ان تاریک کونوں میں جمع کرتی جاتی" جہاں روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔

ایک ایک کرکے وہ انھیں اپنے تھیلے میں رکھنے لگی پھر اس کے ہاتھ رک گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ آدمی کو دیکھ سکتی ہے وہ اس وقت اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوگا۔ کہر آلود موسم کا دھندلا دن، ٹائپ رائٹر اور کورے کاغذ جنھیں وہ آنے سے پہلے جوں کا توں میز پر چھوڑ آئی تھی۔

وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور اخبار کے کاغذوں کو انگیٹھی میں جھونک کر آگ جلا رہا تھا۔ انگیٹھی کا دھواں اوپر اٹھتا، چمنی میں جاتا پھر لوٹ کر پانی بن جاتا۔ آدمی بار بار آستین سے آنکھیں پونچھنے لگتا تھا۔

لڑکی صوفے پر لیٹی تھی۔ سرہانے کشن تھا کشن کے نیچے کتابوں کا تھیلا اور تھیلے کے اوپر ناشتے دان، جس کے اندر سے سلاد اور کھٹے دہی کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ سر دوسری طرف تھا۔ وہ آدمی کی پیٹھ کا وہ حصہ دیکھ رہی تھی جہاں اس کی قمیض پتلون سے باہر نکل کر نیچے لٹک رہی تھی۔

آدمی نے سر گھمایا تو آگ کی لپٹیں بھی اونچی ہونے لگیں۔ دھوئیں کے پیچھے لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں میں آگ اور لڑکی ایک دوسرے کی باہنوں میں جھول رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور صوفے پر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں لڑکی کا سر کشن پر ٹکا تھا اور پاؤں نیچے لٹک رہے تھے اور اس وقت اسے یاد آیا کہ نائلون کی جرابوں میں لڑکی کے پاؤں بہت ٹھنڈے رہتے تھے۔ لڑکی ایسی ساکت تھی کہ پیروں کا ہلنا اسے وہم سا معلوم ہوا۔ "سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

لڑکی کے پیر ہوا میں ہلے۔ "نہیں" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"بس میں بہت ٹھنڈک تھی۔" اس نے کہا۔ "سڑکوں پر پانی جم گیا تھا۔"

"کب پہنچے؟" لڑکی نے پوچھا۔

دوپہر کو۔ اسی وقت تمہیں فون کیا تھا۔

"کیا بیماری تھی؟" لڑکی نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں؛" آدمی نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں؟"

"وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی۔" آدمی نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا گویا اپنی جلد کی جھریوں کو برابر کر رہا ہو۔

"تین دن تک۔" لڑکی نے کہا۔

"مطلب؟"

"وہ تین دِنوں تک تمھیں دیکھتی رہی؟"

آدمی نے سر اُٹھایا۔ حیرت سے لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ آگ میں تپ رہا تھا۔ وہ عجیب سی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کچھ پوچھ رہی ہو۔ آدمی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگا۔ سفید کنوارا ہاتھ جس نے ابھی تک صرف سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو چھوا تھا لیکن ان کے اندر کے بوسیدہ صفحات کو نہیں پڑھا تھا جن میں لوگ شادی کرتے ہیں، ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، بوڑھے ہو جاتے ہیں، اکیلے کمروں میں مر جاتے ہیں۔ ایک آدمی کے اندر ایک اندھی شہوت جاگی جس کا اس وقت لڑکی کے جسم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے اسے اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ اس کے جسم کو اپنے چالیس سالوں میں سمیٹ لینے کے لیے اور وہ اس کی طرف کھنچتی چلی آئی۔ بالکل ایک کبوتر کی طرح اس کے سینے میں سمٹ گئی۔

"کیا تم اس کے ساتھ سوئے تھے؟" لڑکی نے دھیمی آواز سے پوچھا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ اسے وہم ہوا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ بھی وہم ہے۔

"تم نے کچھ کہا؟"

"کیا تم اس کے ساتھ . . . ."

آدمی نے سر اُٹھایا اور آہستہ سے اس کے سر کو اپنے سینے سے الگ کر دیا۔

لڑکی نے آدمی کے چہرے کی طرف دیکھا جو تکان، نیند اور گزری ہوئی عمر سے بوجھل تھا۔ اور تب اسے حیرت ہوئی کہ وہ اس سے پیار کرتی ہے اور اب وہ کچھ کہے گا جس کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔

انگیٹھی کے کوئلے اب دہک رہے تھے۔

کچھ دیر بعد لڑکی صوفے سے اُٹھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹائپ رائٹر میں لگے سارے کاغذوں کو دیکھا پھر اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر جا کر ٹھہر گئیں۔ پارک اندھیرے میں ڈوبا تھا اور تالاب کی جگہ صرف ایک سفید چٹ دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کی روشنیاں ایک لمبی جھالر کی طرح شہر کے دونوں کناروں پر لٹک رہی تھیں۔ اس نے کرسی میز کے پاس کھسکالی اور آدمی کی ترجمہ

کی ہوئی عبارت ٹائپ کرنے لگی۔ ٹائپ کرتے وقت اسے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ جیسے وہ دو زبانوں کے درمیان پھیلے ہوئے جنگل میں اکیلی، بے نیاز اور سب خطروں سے آزاد گھوم رہی ہے۔ لیکن پیچھے صوفے پر لیٹا آدمی اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ رہا تھا جہاں بھورے بالوں کا جوڑا ڈھیلا ہو کر گردن پر لٹک آیا تھا۔ وہ اس کے ترجمے کو پڑھتی تو ہونٹ ہلنے لگتے پھر ہونٹوں پر آتے ہوئے انھیں لفظوں کو جلدی جلدی کاغذ پر ٹائپ کرنے لگتی۔ اب وہ اس کی بیوی کو بھول گئی تھی۔ اس سے الگ ہو گئی تھی۔ بس کبھی کبھی سر اُٹھا کر کسی لفظ کا مطلب پوچھ لیتی اور وہ سوچنے لگتا کہ پچھلی رات وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا اور اب یہاں ہے۔ کل دوپہر کے وقت وہ کتابوں کی دکان پر جائے گا، لڑکی سے جھوٹ بولے گا۔ بیوی کے پاس جا کر لوٹ آئے گا۔ اسی طرح دن گزرتے جائیں گے۔ لیکن اس سب کا کوئی حاصل ہے؛

آدمی نے ہاتھ آگے بڑھایا اور دھیرے سے لڑکی کی پیٹھ کو چھوا، وہ چونک پڑی۔ پیچھے مڑ کر آدمی کو دیکھا۔ زرد چہرے پر کمزور سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"کچھ چاہیے؛"

"اب بس کرو۔ باقی کل کر لینا۔" آدمی نے کہا۔

"بس تھوڑا سا بچا ہے، تم سو کیوں نہیں جاتے۔"

کیا اس عمر میں لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں۔ بیوی ہونے سے قبل؛ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پلکوں کے اندھیرے میں ٹائپ رائٹر صرف ایک لفظ ٹائپ کر رہا تھا۔ نیند۔ نیند۔ اور نیند کہیں نہیں تھی۔

رات گئے تک لڑکی ٹائپ کرتی رہی۔ وہ رفتہ رفتہ باب کے آخری حصے تک پہنچ گئی تھی۔ کہانی کے سیاہ جنگل میں جب کبھی وہ بیچ میں بھٹک جاتی تو کبھی آدمی اور کبھی لغت اس اندھیرے کو پار کرا دیتے اور وہ معنی کی صاف روشنی میں آجاتی اور دوبارہ چلنے لگتی۔ اس طرح رینگتے ہوئے جب وہ آخری سطر پر پہنچی تو کچھ دیر تک وقفے کے سیاہ نقطے پر ٹھہری رہی۔ کاغذ کے باقی حصے کو دیکھتی رہی جو خالی پڑا تھا۔ ان تین دنوں کی طرح خالی جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا اور

وہ اکیلی شہر کی سڑکوں پر گھومتی پھرتی تھی اور اس وقت اسے عجیب سا محسوس ہوا کہ خالی پن کا مطلب نہ تو وہ آدمی سے پوچھ سکتی ہے اور نہ لغت میں تلاش کر سکتی ہے۔

اس نے رولر سے کاغذ باہر نکالا، ٹائپ رائٹر کو بند کیا، کرسی کو پیچھے کھسکایا اور بیچ کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ فرش پر کتابوں کی گٹھری رکھی تھی اور آدمی اس سے بے خبر صوفے کے سرہانے لیٹا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اگر وہ اتر کر نیچے چلی جائے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

پھر ذہن بھٹک گیا۔ شب کا پروانہ کھڑکی کے شیشے میں پھنس گیا تھا۔ وہ کبھی اوپر جاتا تھا کبھی نیچے کھڑکی کے فریم سے بار بار ٹکرا کر عجیب سی بدحواسی کے عالم میں چھٹ پٹا رہا تھا۔ لڑکی نے جھٹ سے کھڑکی کھول دی۔ پروانہ اوپر اُٹھا ایک ننّھی سی جان لڑکی کے رخساروں کو چھوتی ہوئی باہر اندھیرے میں پرواز کر گئی۔ لڑکی کچھ دیر تک کھلی ہوئی کھڑکی سے نیچے دیکھتی رہی۔

اکتوبر کے کہرے پر شراب خانے کی روشنی ایک سرخ دھبے کی طرح چمک رہی تھی۔ اچانک ایک آدمی باہر نکلا اور لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پار کرنے لگا۔ وہ ڈولتا ہوا کبھی ایک طرف جاتا کبھی دوسری طرف جس طرح ابھی کچھ دیر پہلے کھڑکی کے شیشے پر پروانہ ڈگمگا رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر عین کھڑکی کے نیچے فلیٹ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی پتلون کے بٹن کھولنے لگا۔ لڑکی نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور واپس کمرے میں لوٹ آئی۔ اس نے بالوں کا جوڑا کھولا۔ کانٹوں کو نکال کر میز پر رکھا پھر اپنے بیگ سے ویسلین کی ٹیوب نکالی، انگلی سے اسے دبایا، نکلی ہوئی ویسلین کو اپنے چہرے پر، کانوں کے پیچھے والے حصے پر اور اپنی بانہوں پر ملنے لگی۔ اچانک اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ اس کی بیوی بھی اس کے پاس جانے سے پہلے یہی کرتی ہو گی؟

سارے جسم کو مروڑتی ہوئی کسی شے نے اس کے اندر کروٹ لی۔ اس نے اس کی بیوی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بیوی — ایک داغ دار اذیت۔ جو جسم میں کیڑے کی طرح کلبلاتی ہے، اوپر اُٹھنے کے لیے تلملاتی ہے پھر نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا وہ مُنہ پر ہتھیلی رکھ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔ بیسن پر روہری

ہو کر جھک گئی۔ جسم میں جس شے نے کروٹ لی تھی وہ ایک ہی قے میں باہر نکل آئی۔ پانی میں ایک زرد چکتے کی طرح تیرتی ہوئی۔

قے کرنے کے بعد اس نے مُنہ دھویا، آنکھوں پر پانی چھڑکا اور چہرہ پونچھنے کے لیے جب اس نے تولیہ اُٹھایا تو اس کی آنکھیں بیسن کے شیشے میں ٹھٹھک گئیں۔ شیشے میں اس بوڑھی پوپلی عورت کا چہرہ جھانک رہا تھا جسے اس نے گرجا گھر میں دیکھا تھا۔ لیکن اب وہ ہنس نہیں رہی تھی۔ بوڑھی عورت اس سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اب لڑکی کچھ نہیں سننا چاہتی تھی نہ اپنے گناہ کے بارے میں نہ آنے والی زندگی کے بارے میں..... اس سے پہلے کہ بڑھیا اپنا مُنہ کھولتی لڑکی اسے آئینے میں اکیلا چھوڑ کر کمرے میں چلی آئی۔

وہ اس صوفے پر آکر بیٹھ گئی جس پر آدمی لیٹا تھا۔ اس نے کمرے کی روشنی گل کردی لیکن اندھیرا نہیں ہوا۔ آگ کی بجھتی ہوئی زرد روشنی سب چیزوں پر پڑ رہی تھی۔ ٹائپ رائٹر پر کتابوں کے تھیلے پر اور کشن سے ٹکے ہوئے آدمی کے سر پر۔ اس نے کپڑے اتارے، الماری سے کمبل نکالا، دھیرے سے اسے آدمی پر ڈال دیا پھر اس کا ایک سرا اُٹھا کر خود بھی اس کے نیچے لیٹ گئی۔

وہ ایسا بے جان پڑا تھا کہ کچھ دیر تک اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ جاگ رہا ہے یا سویا ہوا ہے۔ اسے صرف اس کی سانس سنائی دے رہی تھی۔ سینے کے اندر غرّاتی ہوئی۔ اس نے ٹٹول کر کھلی ہوئی قمیض کے بیچ اس کے عریاں سینے کو چھوا جہاں کچھ سفید بال نکل آئے تھے اور پھر اپنا سر اس پر ٹکا دیا۔ آدمی میں حرکت ہوئی۔ ایک گرم سی لہر اس کے لہو کو گرمانے لگی۔ نہیں.... نہیں... نہیں۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا لیکن جب اس نے آنکھیں کھولیں تو لڑکی کا سر اس کے اوپر تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال کمرے کے اندھیرے کو اور گہرا کر رہے تھے۔ وہ ہل رہی تھی۔ کچھ دیر تک آدمی جان ہی نہ سکا کہ وہ رو رہی ہے۔ آدمی کے سینے پر ایک گرم سی لکیر بہہ رہی تھی۔

"سنو!" آدمی نے بہت چپکے سے کہا "میں مرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ــــ؟" لڑکی نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آدمی کبھی کبھی اس سے اپنی مادری

زبان میں بات کرنے لگتا تھا۔ جسے وہ بالکل نہیں سمجھ پاتی تھی۔

”تم نے کچھ کہا؟“

وہ دھیرے دھیرے اس کا سر سہلانے لگا۔ لڑکی ماں سے بچّی بن گئی تھی۔ اب آدمی اس سے ایسا سچ بول سکتا تھا جس کا ترجمہ کرنا لڑکی کے لیے ناممکن تھا۔

کوّے اور کالا پانی

ماسٹر صاحب پہلے شخص تھے جن سے میں اس چھوٹے سے ویران اور معمولی سے پہاڑی قصبے میں ملا تھا۔ پہلے ہی دن جب میں بس سے اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سارے شہر میں زور کی بارش ہو رہی ہے۔ بھوالی میں دھوپ، رام گڑھ پر بادل اور یہاں بارش۔ ہماری بس نے تین گھنٹوں کے دوران تین الگ الگ موسم دیکھے تھے اور اب وہ بیچ بازار میں کھڑی تھی۔ اس پر سے میرا سامان اتارا جا رہا تھا؛ معمولی سامان جو میں دلی سے اپنے ساتھ یہاں لایا تھا۔ بابو کا پرانا ہولڈال اور پرانے زمانے کا ٹین کا بکس جس کا پرانا پن ظاہر کرتا تھا کہ اسے بار بار سفر میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

میں بیچ بازار میں کھڑا تھا۔ سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا۔ کنارے پڑا ہوا میرا سامان میری بدحالی کو نمایاں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے بارش میں سارے شہر والوں کی خستہ حالی اپنی گرہیں کھول کر باہر نکل آئی ہے۔ صرف میرے بریف کیس سے معلوم ہوتا تھا کہ میں پیشے سے کلرک ہوں۔ اور میں نے بھی اسے نفاست کی آخری نشانی کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا۔ لیکن صرف نفاست کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اس بریف کیس میں وہ پورا منصوبہ موجود تھا جس کی وجہ سے میں اپنا شہر اور گھر گرہستی چھوڑ کر اس نامانوس پہاڑی شہر میں آگیا تھا۔

ہندوستان کے چھوٹے قصباتی شہر یوں بھی تکلیف دہ ہوتے ہیں، اوپر سے بارش، ٹھنڈ اور اندھیرا۔ جب بس رینگنے لگی تو ایک احمقانہ خیال آیا کہ دوڑ کر اس میں بیٹھ جاؤں اور کنڈکٹر سے درخواست کروں کہ مجھے دوبارہ بھوالی، ہلدوانی اور دلی کی طرف لے چلے، اپنی زندگی کی مانوس اور محفوظ روشنی میں جہاں نہ اجنبی شہر کی بارش تھی نہ پہاڑی ڈھابوں کی بو، لیکن بس رکی نہیں نہ مڑی کہ

اُسے کہیں اور جانا تھا۔ میں وہیں کھڑا کھڑا اُس کی عقبی سرخ روشنی کو دیکھتا رہا جو بارش کی دھند میں خون کے میلے دھبّے کی طرح دور ہوتی گئی۔

میں نے آس پاس دیکھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ موٹر روڈ سے قدرے اونچائی پر۔ جس پر زرد روشنی میں دھندلائے ہوئے تین چار چھپّر دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے نچلی کھوہ میں بس اسٹیشن سے تقریباً لگی ہوئی ایک چائے کی دکان تھی جہاں دو چار لوگ ٹاٹ کی کھپریل کے نیچے بیٹھے تھے۔ میں نے اب اپنے بریف کیس کو چھتری کی طرح سر پر رکھ لیا تھا۔ لیکن میرے ٹین کے صندوق اور بریف کیس کی حالت غیر تھی۔ سڑک کے کنارے بارش میں بھیگ کر وہ مجھ سے بھی زیادہ قابلِ رحم نظر آرہے تھے۔ میں کچھ دیر اس اُمید میں کھڑا رہا کہ چائے کی دکان میں بیٹھا کوئی نہ کوئی شخص ضرور میری حالت پر رحم کھائے گا۔ لیکن اب وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ بارش کی دیوار نے مجھے اچانک اپنی آڑ میں لے کر باقی دنیا سے الگ کر دیا تھا۔ میرے ساتھ تین چار سواریاں اور بس سے اتری تھیں۔ لیکن نہ معلوم شہر کے کس اندھیرے کونے میں گم ہو گئی تھیں۔

اچانک مجھے اپنے سامنے ایک چھتری دکھائی دی۔ کچھ دیر تک وہ میرے آگے ڈولتی رہی گویا یہ طے نہ کر پا رہی ہو کہ میں کون ہوں۔ آدمی یا بھوت؟ پھر چھتری کے اندر سے ایک زرد پہاڑی چہرہ باہر آیا۔

"یہ آپ کا سامان ہے؟" اس نے میرے ٹرنک اور ہولڈال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"اور آپ؟"

"میں؟"

"کہاں جانا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"پاس میں کوئی ہوٹل ہے؟" میں نے تقریباً گھگھیاتے ہوئے پوچھا۔

"ہوٹل! یہاں؟" انھوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں زندگی ہی میں جنت کی آرزو کر رہا ہوں۔

"کوئی بھی جگہ، ٹھہرنے کے لیے۔"

"کتنے دن کے لیے؟" انھوں نے پوچھا۔

میں تذبذب کے عالم میں اُنھیں دیکھتا رہا۔ گھر سے چلا تھا تو دنوں اور مہینوں کا کوئی حساب نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا انھوں نے مجھے بھی چھتری میں کر لیا۔ پہلے صرف میں ہی بھیگ رہا تھا اب ایک چھتری کے نیچے ہم دونوں ہی تھوڑا تھوڑا بھیگنے لگے۔

"ایک ڈاک بنگلہ ہے۔ لیکن آپ کو تین کلومیٹر اوپر چڑھنا پڑے گا۔"

"کوئی قلی مل سکتا ہے؟"

"اس وقت؟" انھوں نے بازار کی طرف نگاہ ڈالی پھر میری طرف دیکھا۔ پھر یکایک کچھ سوچ کر میرے صندوق اور ہولڈال کو اُٹھا لیا۔

"چلیے۔ میرے ساتھ۔"

میں نے انھیں روکنا چاہا لیکن وہ میرا صندوق اُٹھا کر آگے بڑھ چکے تھے۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں بھی اپنا ہولڈال اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنا دُبلا پتلا شخص ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے ہاتھ میں ٹرنک پکڑے اتنی تیزی سے اوپر چڑھ سکتا ہے۔

بس اسٹیشن پیچھے چھوٹ گیا۔ بازار کی دکانیں بہت نیچے رہ گئیں اور ہم اوپر چڑھتے گئے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ چڑھتے گئے اور میں اُن کے پیچھے کھنچتا گیا۔ بارش کے بلبلوں پر بار بار میرے پیر پڑتے۔ ایک بار پیچھے مڑ کر انھوں نے مجھ سے کچھ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔ میں صرف اپنے دل کی دھڑکن ہی سُن پا رہا تھا جو ہر قدم پر تیز ہو جاتی تھی۔ ماتھے سے ٹپکتی ہوئی بوندوں میں کتنا پسینہ تھا اور کتنا برساتی پانی اس کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔

اس دن سفر کی تکان اور اپنی بے قراری کے باوجود میں بغیر تھکے کتنا اوپر چڑھ گیا تھا یہ سوچ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میں نے زندگی کو عبور کیا ہے، پہاڑ کو نہیں۔ پہاڑ پر چڑھنا تو دور کی بات ہے، گھر کا زینہ چڑھتے وقت بھی میری سانس پھولنے لگتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی مقام پر آنا ہوا تھا وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں۔ اپنی مرضی ہوتی تو دہلیز کے باہر پاؤں بھی نہ نکالتا۔ کم سے کم اس مقام کے لیے تو بالکل ہی نہیں۔ لیکن اس جگہ کا انتخاب میں نے نہیں کیا تھا اور جنھوں نے کیا تھا میں انھیں کو ڈھونڈھنے اتنی دور چلا آیا تھا۔

"آئیے اندر چلے آئیے۔" انھوں نے دروازہ کھول کر میری طرف دیکھا۔

مجھے فوری طور پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں بارش سے بچنے کے لیے دہلیز پر کھڑا تھا۔ اچانک کوئی چیز بھک سے جل اُٹھی۔ لالٹین کی روشنی۔ اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے کسی ہوٹل یا سرائے میں نہیں بلکہ اپنے گھر لے آئے ہیں۔ میں پس و پیش کے عالم میں شاید کچھ دیر اور وہیں کھڑا رہتا اگر ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے اندر نہ دھکیل دیتا۔

ایک چیز ہے خواہش انسان کے لیے شاید یہ سب سے بڑا سراب ہے۔ خواہش جس لکیر پر چلتی ہے، ہم اس سے کتنا چھٹک چھٹک کر چلتے ہیں۔ وہ ہمیں کاٹ جاتی ہے اور ہم دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ میرا ایک حصہ گھر پر چھوٹ گیا تھا اور ایک حصہ اس شہر میں تھا پانی اور ہوا میں ٹھٹھرتا ہوا اور شاید ایک تیسرا حصہ بھی ہے جو ہمیں ان گنت حصوں میں بٹتا ہوا دیکھتا ہے۔

پھر اپنی بے بسی، مظلومی اور ناطاقتی پر غصہ آتا ہے۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس پر ہمارا کوئی بس نہیں ہے۔ جس طرح ماسٹر صاحب مجھے اوپر لے آئے تھے اسی طرح آندھی کا جھونکا مجھے ان کے گھر کے اندر گھسیٹ لے گیا تھا۔ "ارے بیٹھیے .... باہر کیوں کھڑے ہیں۔" انھوں نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود اسٹول پر بیٹھ کر اپنے میلے جوتوں کے تسمے کھولنے لگے۔

"میں نے آپ سے ہوٹل چلنے کے لیے کہا تھا۔" میں نے قدرے چڑچڑاتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب اسے ہوٹل ہی سمجھیے۔ اس موسم میں کہاں جائیں گے۔" وہ ہنسنے لگے۔ یکبارگی میرا جی چاہا کہ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر باہر نکل جاؤں۔ لالٹین کی روشنی میں ہلتا ہوا ان کا بوسیدہ کمرہ کیچڑ میں لت پت میرا جسم اس کا کوئی مفہوم ہے؟ کیوں نہیں۔ میرے اندر کسی نے کہا۔ تم یہاں آئے ہو تو تمھیں اپنے پرانے مفہوموں کو فراموش کرنا پڑے گا..... اس وقت واقعی میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بارش، اندھیرا اور ہوا۔ سب پیچھے رہ گئے اور میں.....

میں اندر آگیا۔ پہلی نگاہ میں وہ کسی بنگلے کی دھوئیں سے اٹی ہوئی ملازموں والی کوٹھری معلوم ہوتی تھی۔ ہوا میں کھلی ہوئی جس میں بنا روک ٹوک بادل اندر آتے تھے لیکن اندر کا دھواں مشکل ہی سے باہر نکل پاتا تھا۔ کمرے سے ملحق ایک گودام تھا جہاں مٹی کے تیل کا ایک اسٹو اور کچھ

برتن رکھے تھے۔ وہی شاید ان کا باورچی خانہ تھا۔ جس کے کونے میں پانی سے بھری بالٹی، لوٹا اور ایک پیڑا رکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ نہاتے بھی باورچی خانے ہی میں ہیں۔ کچن کی دیوار میں ایک چوکور سوراخ تھا جس کے دوسری طرف وہ چھجہ دکھائی دیتا تھا۔ جہاں الگنی پر انھوں نے سکھانے کے لیے اپنے کپڑے ڈال رکھے تھے۔ یہ کپڑے اب بارش میں بھیگ رہے تھے۔

وہ اسٹوو جلا رہے تھے اور بار بار پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھ لیتے تھے گویا انھیں ڈر ہو کہ ان کی آنکھ بچا کر میں اچانک غائب نہ ہو جاؤں۔ لیکن اب میں ان کے پلنگ میں دھنس چکا تھا۔ میرا وزن زیادہ نہیں ہے لیکن میرے بیٹھتے ہی ان کے پلنگ کی نواڑ زمین کو چھونے لگی تھی۔ اس طرح پلنگ پر بیٹھے ہونے کے باوجود میں فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ چائے کے دو گلاس لے کر آئے اور سامنے چٹائی پر بیٹھ گئے۔

"آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔"

"کیسے؟" میں نے حیرت سے اُنھیں دیکھا۔ چائے کی گرم بھاپ میں نظر آتا ہوا اُن کا لانبا، زرد چہرہ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو، مجھے یاد نہیں آیا۔

"کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون یہاں کا ہے کون باہر کا۔ آپ بس سے اتر کر بارش میں کھڑے بھیگتے رہے۔ یہاں کا آدمی ہوتا تو سیدھے اپنے گھر کی طرف بھاگتا۔" وہ ہنسنے لگے۔ اور میں نے دیکھا کہ ان کے دانت پیلے ضرور پڑ گئے تھے لیکن گندے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کے زرد اور مرجھائے چہرے پر یہ دانت اپنی جگہ بالکل موزوں معلوم ہوتے تھے۔

"ویسے اس موسم میں یہاں بہت کم مسافر آتے ہیں۔" انھوں نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے ان کی بات سنتے ہی میں انھیں اس موسم میں اپنے آنے کا سبب بتا دوں گا۔ لیکن میں چپ رہا۔ ایک بار ان کے ساتھ یہاں آنے کی جو غلطی کی تھی۔ اب اسے دہرانا نہیں چاہتا تھا....

"آپ یہاں کب سے ہیں؟" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"پانچ سال..... نہیں چھ سال سے....." انھوں نے چائے کا گلاس نیچے رکھ دیا اور انگلیوں پر گزرے ہوئے برسوں کا حساب لگانے لگے۔ جس سال شاستری جی کا تاشقند میں انتقال ہوا ہے میں یہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ اندوہناک خبر اسپتال میں سنی تھی۔

"آپ اسپتال میں تھے؟" میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں ان سے پوچھا۔

"جی ہاں.... ویسے تو الموڑہ میں کبھی ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے لیکن خود میرے ایک چچا ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے ہی مجھے یہاں کے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ جب صحت یاب ہوا تو پتہ چلا کہ یہاں کے ہائی اسکول میں انگریزی کے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے، بس پھر میں یہیں رہ پڑا۔" انھوں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"شفایاب ہونے آیا تھا یہ نہیں سوچا تھا کہ بیکاری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"آپ کا گھر یہاں نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اسے گھر کہیں گے؟" انھوں نے ایک سرسری سی نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی گویا اُسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ ان کی شکایت آمیز نگاہ میں کوئی ایسی ہی چیز تھی کہ باورچی خانے میں رکھی بالٹی ٹمٹماتی ہوئی لالٹین چوکی پر رکھا ہوا اسٹوو اور پلنگ میں دھنسا ہوا میں ـــ سب کچھ یکایک قابلِ رحم سا نظر آنے لگا۔

"آپ کو سردی لگ رہی ہو تو آگ جلا دوں۔" انھوں نے کہا۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں سچ مچ ٹھیک تھا۔ اگر ٹھیک کا مطلب ہے سست پڑ جانا، اتنا سُست کہ تکان بھی ہار مان لے مجھے صرف باہر کی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں، بارش میں بھیگتی ہوئی رات اور ٹپکتا ہوا ان کا گھر۔ اندر اور کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میری بے دلی کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سے گئے۔ گویا مجھے اپنے گھر لا کر انھوں نے کوئی جرم کیا ہو۔

"یہاں ایک ڈاک بنگلا ہے۔ اگر آپ چاہیں....." انھوں نے میرے طرف دیکھا۔

"وہاں اجازت نامے کی ضرورت پڑے گی۔ نہیں؟"

"ہاں پڑے گی تو۔" انھوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ لیکن ایک دو دن کی بات ہو تو

چوکیدار کوئی حجت نہیں کرتا..... آپ کو کتنے دن رہنا ہے؟"

اس بار ان کے لہجے میں لوٹ لینے والا انداز نہیں تھا بلکہ میری مدد کرنے کا جذبہ تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اُس پل شاید میں اُنھیں سب کچھ بتا دیتا۔ یہاں اتنی دور آنے کا سبب اور وہ بھی ان سردیوں میں۔ لیکن میرے بغیر بتائے ہی وہ بھانپ گئے تھے کہ میں نہ تو کوئی زائر ہوں نہ جہاں گرد سیاح پھر میں ہوں کون؟ ایک عجیب سی تکان اور مایوسی نے مجھے گھیر لیا۔ ماسٹر صاحب کو یہ بتانے کے لیے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں مجھے اپنے پورے خاندان کی تاریخ بتانا پڑے گی اور کیا اس کے بعد بھی وہ میرے آنے کا مقصد سمجھ سکیں گے؟

پتہ نہیں انھوں نے اس دھندھلکے میں کیا دیکھا۔ میرا چہرہ یا ادھیڑ عمر میں پیدا ہو جانے والا خبط کہ اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے وہیں چھوڑ کر وہ باہر چھجے پر چلے گئے اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو سمیٹ کر باورچی خانے میں لے آئے۔ پھر ایک ایک کرکے انھیں نچوڑنے لگے۔

میں نے چین کی سانس لی۔ ان کی توجہ میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے اپنا بستر کھول کر فرش پر بچھایا۔ لالٹین میرے سرہانے والی تپائی پر رکھی تھی۔ اس کی زرد روشنی میں میں نے بریف کیس میں رکھے کاغذوں کو باہر نکال کر یوں دیکھا جس طرح کوئی طالب علم امتحان سے قبل اپنے نوٹس کی ورق گردانی کرتا ہے اور اچانک اسے سب کچھ فضول اور بے معنی سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ جائداد کے بوسیدہ، خستہ کاغذات جنھیں بابا چھوڑ گئے تھے اور جو اس کوٹھری میں اور زیادہ بے وقعت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کاغذوں کے درمیان بڑے سلیقے سے تین خط رکھے تھے۔ بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی تحریروں کو پہچان لینا مشکل نہیں تھا۔ لیکن تیسرا مڑا تڑا کاغذ؛ گھر چھوڑنے سے قبل ماں نے سب کی آنکھ بچا کر یہ کاغذ مجھے دیا تھا اور میں نے اسے دیکھے بغیر جلدی سے دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ ماں کا خط ـــــ؛ وہ جو ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ حروف کو کاغذ پر منتقل کرتی تھی۔ پتہ نہیں اُس نے کس زبان میں اپنا پیغام بھیجا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اُسے پڑھنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں مرے ہوئے باپ کے کاغذ اُتنے ہی مردہ معلوم ہوتے تھے جتنے زندہ لوگوں کے خط۔ اگر ان سب کو ماسٹر صاحب کے اسٹوو

میں جھونک دوں تو میرا گھر، خاندان والے، مردہ اور زندہ رشتوں کا کچا چٹھا سب ایک ہی شعلے میں جل کر راکھ ہوجائے گا بس ایک میں رہ جاؤں گا۔ میں اور وہ . . . . وہ جن سے ملنے میں یہاں اتنی دور آیا تھا۔

اچانک کاغذوں پر ماسٹر صاحب کی پرچھائیں نظر آئی۔ وہ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ نم تھے اور آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔

”معلوم ہوتا ہے آپ کوئی مقدمہ لڑنے آئے ہیں،“ وہ مسکرا رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی سارے کاغذ سمیٹ کر بریف کیس میں ٹھونس دیے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ کل پیشی کا دن ہے۔ دس سال بعد . . . . . ایک پاگل سی خواہش میرے دل میں جاگی کہ اسی وقت گھر پر ان سے مل لوں اور کل صبح کی بس سے دلی لوٹ جاؤں۔ لیکن ماسٹر صاحب نے میرے اس پاگل پن کا سلسلہ بیچ ہی میں ختم کر دیا۔ ”چلیے ہاتھ منہ دھو لیجیے۔ پانی گرم ہوگیا ہے۔“

اُس رات میں ماسٹر صاحب ہی کے کمرے میں سویا۔ میں اپنا بستر بند ساتھ لایا تھا۔ اس لیے انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ بضد تھے کہ میں پلنگ پر ہی سوؤں۔ وہ خود فرش پر سونا چاہتے تھے اور مجھے پلنگ پر سلانا چاہتے تھے۔ اب میں ان سے کیسے کہتا کہ ان کے پلنگ میں جھولتے ہوئے رات بھر مجھے کسی طوفان کا دھوکا ہوگا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کھانے کے مسئلے پر ایک اور طوفان کھڑا ہوگا۔ میری بیوی نے جو کھانا میرے ساتھ کیا تھا وہ بس کے سفر کے لیے ہی نہیں بلکہ زندگی کے سفر کے لیے بھی کافی تھا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ کھانا پکانے کے بجائے میرے ہی کھانے کو سوارت کر لینا بہتر ہوگا۔ ٹھنڈے موسم کی وجہ سے وہ اب بھی تازہ تھا۔ دور دراز کے سفر کے خیال سے تیار کیے جانے والے اس کھانے کے شہری ذائقے میں ان پہاڑوں پر بارہ گھنٹے کی چڑھائی کے باوجود بھی کمی نہیں آئی تھی۔ میرے کھلے ہوئے ناشتے دان کو دیکھ کر ان کے چہرے پر صحرا کی سی ویرانی چھا گئی . . . . پوریاں، اچار، سبزی اور پلاؤ الگ الگ کٹوریوں میں سجے ہوئے . . . . شاید اُنھیں اپنی غلطی پر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ مجھ جیسے شخص پر رحم کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے کہا کچھ نہیں، چپ چاپ اسٹوو جلا کر کھانا گرم کرنے لگے۔

„ ان کا باورچی خانہ جتنا صاف ستھرا تھا، کمرہ اتنا ہی بے ترتیب۔ فرش پر گرد آلود کتابوں اور پرانے رسالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ کوٹھری کی چھت دھوئیں کی سیاہی سے رنگی ہوئی تھی۔ دیوار پر ایک الماری تھی جس کا رنگ اُڑ چکا تھا اور جس کی ادھ کھلی درازوں سے کپڑے باہر جھانک رہے تھے۔ کمرے میں ویسی ہی بے سروسامانی تھی جیسی سرائے کے کمروں میں ہوتی ہے۔ مجھے یہ سوچ کر ہی خوف محسوس ہوا کہ وہ ہر موسم میں دن رات یہاں اکیلے رہتے تھے۔ شاید اسی اکیلے پن سے بچنے کے لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اُنھیں میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس بات پر مجھے اتنا تعجب نہیں تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہاں لے آنے کے بعد انھوں نے ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں؟ تب ایک عجیب سا شک مجھے برملانے لگا۔ شاید انھیں سب کچھ معلوم ہے تبھی تو وہ بس اسٹینڈ پر پانی میں کھڑے بھیگتے رہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے تھے۔ لیکن میرے بارے میں اُنھیں کس نے بتایا ہوگا؟ سوائے ان کے جن سے ملنے میں آیا تھا، کیا کسی نے پہلے ہی سے اُنھیں میری آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا؟

„ لیجیے جلدی کھا لیجیے۔ نہیں تو ایک منٹ میں سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ انھوں نے میرے ناشتے دان کا کھانا تھالی میں سجا کر سامنے رکھ دیا۔

„ آپ نہیں کھائیں گے؟“

„ میں تو کھانے کے بعد ہی باہر نکل جاتا ہوں۔ جب تک کچھ دیر کے لیے ٹہل نہیں لیتا، نیند نہیں آتی .... آپ کھائیں۔“

ماسٹر صاحب میرے سامنے چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اکیلے کھاتے ہوئے مجھے عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے۔ ان کی بیوی شاید نیچے ماں کے پاس ہوں گی اور بچے اپنے کمروں میں اسکول کا کام کر رہے ہوں گے۔ ماسٹر صاحب کی دھنوائی ہوئی سرد کوٹھری روشنی میں مجھے اپنے گھر کے لوگ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ ابھی بارہ گھنٹے قبل میں ان کے ساتھ تھا....

„ دیکھیے پانی رک گیا۔ کل صبح تک مطلع صاف ہو جائے گا۔ ماسٹر صاحب کے لہجے میں بچوں کا سا

جوش نظر آیا۔

میرے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ ٹین کی ڈھلواں چھت سے پانی کی دھار نیچے گر رہی تھی لیکن بارش واقعی تھم گئی تھی۔ چھجّے کے باہر کہرا اب بھی تھا لیکن اتنا باریک اور اکہرا کہ اس کے پیچھے دھلے ہوئے تارے جگمگا رہے تھے۔

"آپ کا اسکول قریب ہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو بتانا بھول گیا آپ دراصل اسکول ہی میں بیٹھے ہیں۔" وہ مسکرانے لگے۔

"یہ اسکول ہے؟" میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ "جی ہاں یہ اسکول ہی کا حصّہ ہے۔ مجھے ابھی تک مکان نہیں مل سکا ہے اس لیے انھوں نے اسکول ہی کا ایک کمرہ مجھے دے دیا۔ یوں بھی چھٹیوں میں سارے کمرے خالی پڑے رہتے ہیں..."

"آپ چھٹیوں میں کہیں جاتے نہیں؟"

"ایک آدھ دن کے لیے الموڑہ چلا جاتا ہوں لیکن وہاں پر میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہی پرانے لوگ، جن سے میں بچنا چاہتا ہوں، آگھیرتے ہیں۔"

"یہاں تنہائی نہیں محسوس ہوتی؟"

وہ کچھ دیر چپ رہے پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "یہاں اکیلا رہتا ہوں پھر بھی ویسی گھبراہٹ نہیں ہوتی جیسی الموڑہ میں ہوتی ہے۔ پھر جب دل چاہتا ہے بابا کے پاس چلا جاتا ہوں۔"

"بابا کون؟"

انھوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر خفیف سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "ایک ہی تو ہے۔ اور کون؟"

"کیا انھوں نے آپ سے کچھ کہا تھا؟" اس بار میں خود کو نہیں روک سکا۔

انھوں نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ "کس بارے میں؟"

"میرے یہاں آنے کے۔

"کیوں؟ آپ ان سے ملنے آئے ہیں؟" اس بار اُن کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"سنا ہے بہت دور دور سے لوگ اُن کا دیدار کرتے آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن اس موسم میں؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"میں یہاں چھٹی میں آیا ہوں۔ سوچا اُن کی زیارت بھی کرلوں کیا بہت دور رہتے ہیں؟"

وہ کسی سوچ میں گم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بے دلی سے بولے "زیادہ دور نہیں.... ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی چڑھائی ہوگی۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ ناراض ہیں۔ شاید اُنھوں نے میرا یقین نہیں کیا۔ کون ایسا پاگل ہے جو اتنی سردیوں میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنی دور آئے اور وہ بھی ایک انجان پہاڑی شہر کے ایک مقامی بزرگ سے ملنے۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرے برتن سمیٹنے لگے۔ کچھ دیر تک باورچی خانے میں لوٹے اور بالٹی کی آوازوں کے سوا کچھ اور سنائی نہیں دیا۔

پھر اُس رات ان کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

سونے کے وقت بھی خاموشی رہی۔ انھوں نے دوسری اور آخری بار پھر گزارش کی کہ میں ان کے پلنگ پر سو جاؤں لیکن میں پہلے ہی فرش پر اپنا بستر کھول چکا تھا۔ وہ بھی چپ ہو رہے بس اتنا پوچھا کہ کیا وہ لالٹین جلا کر پڑھ سکتے ہیں۔ پھر وہ دیر تک انگریزی کا کوئی ناول پڑھتے رہے جس کے مصنّف کا نام میں نے کہیں بھی پڑھا یا سنا نہیں تھا۔ میں بریف کیس سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ لیکن دیر تک نیند نہیں آئی۔ اتنی طویل زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی اجنبی کے گھر مجھے رات گزارنا پڑی ہو اور واقعی وہ رات کا اگزارنا ہی تھا۔ شب گزاری کے اس مرحلے میں ایک طرف میرا گھر بار، میری نوکری، میری گرہستی جسے پہلی بار چھوڑ کر میں اکیلا باہر نکلا تھا۔ میری بیوی کو اگر پتہ چلتا کہ گھر چھوڑنے کے بعد میرا پہلا پڑاؤ کسی ماسٹر صاحب کی کوٹھری میں ہوگا تو اُسے واقعی حیرت ہوتی۔ مجھے ہمیشہ گھر گھُسا کہتی تھی۔ اُسے ہمیشہ اس بات کا غم رہا کہ اتنی طویل ازدواجی زندگی میں کہیں بھی اس کے ساتھ سفر پر نہیں گیا۔ روزمرہ کے سفر تو بہت کئے مگر چھٹی لے کر کسی مذہبی مقام یا پہاڑی اسٹیشن پر کبھی جانا نہیں ہوا۔

اور اب یہ جگہ جو پہاڑ تو ہے لیکن سیاحت کی جگہ نہیں ہے اور جہاں زیارت گاہ کے نام پر جانوروں کا اسپتال ہے۔ شو کا ایک مندر جہاں وہ رہتے تھے.... کیا اب بھی وہیں رہتے ہیں؟

مجھے عجیب سا محسوس ہوا کہ دلّی کی عادت یہاں بھی نہیں چھوٹی تھی۔ دلّی جہاں سب لوگ انھیں زمانۂ ماضی کی چیز سمجھتے تھے جوں ہی کوئی شخص ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے ہم اسے انتقاماً گزرے ہوئے زمانے کا سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ وہ اب بھی زندہ ہے اور زمانۂ حال میں جی رہا ہے لیکن وہ ہمارے زمانے سے باہر ہے۔

اُس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ ہوا کے (تیز) تھپیڑوں سے کوٹھری کی چھت کی دیواریں ہلنے لگتی تھیں۔ نیچے موٹر روڈ پر کوئی بس یا لاری گزرتی تو پیڑوں کی شاخیں اور جھاڑیاں اُس کے اگلے حصّے میں پھنس کر دیوار سے رگڑ کھانے لگتیں۔ پہیوں کی آواز دیر تک پہاڑیوں میں گونجتی رہتی۔ کبھی کبھی کسی بس کے گزر جانے کے بعد ماسٹر صاحب کتاب سے سر اٹھا کر گھڑی پر نظر ڈالتے اور لمبی سانس کھینچ کر کہتے ”یہ بھوالی کی بس ہے“ یا کچھ دیر بعد جب دوبارہ کسی بس کا ہارن بجتا تو کہتے ”یہ رام نگر جا رہی ہے“۔ میں آنکھیں بند کئے سونے کا بہانہ کئے پڑا رہا۔ پھر نہ جانے کب یہ بہانہ نیند میں بدل گیا۔ آدھی رات کو جب آنکھ کھلی تو لالٹین بجھی ہوئی تھی اور ماسٹر صاحب کروٹ کے بل سو رہے تھے۔ پُوری کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ ایک طویل ساعت گزر جانے کے بعد بھی مجھے یاد نہیں آیا کہ میرے پاس کے پلنگ پر کون سو رہا ہے اور میں وہاں کیا کر رہا ہوں۔

صبح اُٹھا تو دھوپ بستر پر آچکی تھی۔ صاف خنک روشنی کوٹھری میں پھیلی تھی۔ ماسٹر صاحب کی مسہری خالی پڑی تھی۔ باورچی خانے میں پانی کی بالٹی اور لوٹا رکھا تھا اور چولھے کے پاس چائے کا سامان۔ باہر سے ہوا کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اُس کی آواز سن کر ہی جاگ گیا تھا۔

گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ دس بج رہے تھے۔ اتنی دیر تک تو میں کبھی کبھی ہی سوتا ہوں۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا تھرمس اور گلاس تھیلے میں رکھا۔ بریف کیس کھول کر خطوط باہر نکالے جن میں ایک پوسٹ کارڈ بھی تھا جو انھوں نے پندرہ دن پہلے ہی بھیجا تھا۔ ان سب کو سمیٹ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور ماسٹر صاحب کو دیکھنے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر جس چیز پر سب سے پہلے میری نگاہ پڑی وہ پہاڑ تھا۔

پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ یہ پہاڑ ہے۔ سڑک پر چلتا ہوا پہاڑ نہیں بلکہ وہ جسے کل میں نے بس کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ ایک جگہ ٹھہرا ہوا پہاڑ۔ بازار سے اونچائی پر واقع شہر کو سایہ دیتا ہوا۔ کل

اندھیرے اور بارش میں میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اب پہلی بار یقین آیا کہ میں گھر کے باہر ہوں۔ یہ راہ میں آنے والا اسٹیشن نہیں ہے بلکہ ایک آباد علاقہ ہے۔ ایک الگ تھلگ دنیا۔ یہ کوئی سنسان جنگل نہیں ایک بسی ہوئی بستی تھی، جہاں بازار تھا بس اسٹیشن تھا، ایک اسپتال، ایک مندر اور ایک اسکول.....

اسکول میدان میں واقع تھا۔ بازار کے بالائی اور نشیبی حصے میں پیڑوں کا زرد جھرمٹ تھا۔ انھیں پیڑوں کی شاخوں میں اچانک ماسٹر صاحب دکھائی دیے۔ ... اور تب اس کھٹ ..... کھٹ .... کی آواز کا راز میری سمجھ میں آیا۔ وہ کلہاڑی سے درختوں کی شاخیں کاٹ رہے تھے اور شاخیں چرچر کرتی ہوئی نیچے گر رہی تھیں۔

میں اسی راستے سے نیچے اترنے لگا جس سے گزر کر کل اوپر آیا تھا۔ دھیرے دھیرے بازار کی چھتیں نظر آنے لگیں۔ سانولی سلیٹی پتھروں سے ڈھکی، دھوپ میں چمکتی ہوئی۔ لوگوں کا شور اور دکانوں کا دھواں دونوں ایک ساتھ بلند ہو رہے تھے۔ بازار کے نام پر وہاں چند ڈھابے تھے۔ وہیں کھلی ہوا میں ایک بنچ پر میں بیٹھ گیا۔ میں نے چائے طلب کی تو دوسری بنچ سے دو آنکھیں میری طرف اُٹھیں۔ زردی مائل سُرخ اور نشے سے بوجھل .... شاہ جی! بس ایک ہی؛

ننگ دھڑنگ مہاتما میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے دوسری چائے طلب کی تو وہ مسکرائے۔ ڈاڑھوں کی جھرّیوں سے اُن کے لال مسوڑھے جھانکنے لگے۔

"کل ہی وارد ہوئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

اب تک وہ دوسرے ڈھابے کی بنچ پر بیٹھے تھے مجھ سے ہم کلام ہوتے ہی وہ اپنی پسندیدہ میز کو چھوڑ کر میری بنچ پر آ بیٹھے۔ "ماسٹر کے یہاں ٹھہرے ہو؟"

وہ مجھے کوئی پہنچے ہوئے پیر معلوم ہوئے جو دل کا حال جان لیتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے سامنے "جی" کہنے کے سوا میں اور کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ اس کے بعد اگر وہ یہ انکشاف کرتے کہ میں دو بچوں کا باپ ہوں اور دلّی سے آیا ہوں تب بھی مجھے کوئی تعجب نہ ہوتا۔ لیکن اس

کے بعد وہ یکسر خاموش ہو گئے اور چائے پینے میں ایسا محو ہو گئے گویا اسی محویت کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے میرا تعارف حاصل کیا تھا۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

چائے کا گلاس بنچ پر رکھ کر کہنی سے اپنی ڈاڑھی پونچھتے ہوئے اُنھوں نے کہا "یہ پوچھیے کہاں جا رہا ہوں، یہاں تو کچھ ہی دنوں کے لیے ٹھہرا ہوں۔" اُن کی سرخ آنکھوں میں سپاٹ سی بے تعلقی تھی۔

"کہاں ڈیرا جمایا ہے بابا نے؟"

انھوں نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے میں اس اشارے کا مطلب سمجھا کہ خدا کے یہاں لیکن خوش قسمتی سے۔ ان کی انگلی کچھ نیچے ہی رہی جس کا مطلب تھا بازار کے پیچھے کا پہاڑی گومڑ جو دھند اور دھوپ کے حصار سے باہر نکل رہا تھا۔

"شِو کے مندر میں؟"

پہلی بار میرے اندر ایک تجسّس آمیز بے چینی پیدا ہوئی۔

"شِو کا نہیں مہا کال کا مندر کہیے۔" انھوں نے قدرے حقارت سے مجھے دیکھا۔

"کبھی گئے ہیں وہاں؟"

"پہلی بار آیا ہوں۔"

"پہلی بار؟" وہ ہنس پڑے۔ آپ کو کیسے معلوم کہ آپ پہلی بار آئے ہیں.... پہلی بار کچھ نہیں ہوتا۔"

"آپ کو بھی پہلی بار دیکھا ہے۔ میں نے کہا۔

"واقعی؟" انھوں نے میری طرف دیکھا۔ "اور اسے ....؟" انھوں نے پائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو سڑک کے کنارے ہوا میں جھول رہا تھا۔

"پیڑ؟" میں نے متجسّس نگاہوں سے اُنھیں دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اور میں؟" انھوں نے لنگوٹ سے بیڑی نکالی اور بھٹی میں دہکتے ہوئے کوئلے پر رکھ دی۔"

"مجھ میں کیا ہے؟"

بیڑی سلگ رہی تھی اور دھوئیں کی لکیر اوپر اُٹھ رہی تھی۔

میں نے ان کے ننگے بدن کو دیکھا تو ایک ایک ہڈی جاڑے کی سفید دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ٹھٹھرتا ہوا نزار جسم نہیں بلکہ ایک ایسا پنجر جو جسم کو ٹھنڈے خول میں گرمائے رکھتا ہے .... نہیں میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انھیں دیکھتے ہی اچانک مجھے اپنے باپ کی ہڈیاں یاد آگئیں جنھیں میں ایک گٹھری میں باندھ کر دلی سے کنکھل لے گیا تھا اور اگر ٹرین کے جھٹکوں سے ان کی ہڈیاں دوبارہ ترتیب پا جاتیں تو وہ اس شخص کی شکل اختیار کر لیتیں جو اس وقت میرے سامنے موجود تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر ہم نے کسی چہرے کو پہلے نہ بھی دیکھا ہو تب بھی وہ چہرہ سامنے آکر کسی ایسے شخص کی یاد دلا سکتا ہے جو پہلے کبھی زندہ تھا نہ اب ہے۔

"گھومنے آئے ہو؟" ان کی آنکھیں مجھ پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ مجھے چپ دیکھ کر وہ کچھ آگے کھسک آئے، "بابا کا دیدار کرنے آئے ہو؟" "کیوں ٹھیک کہا؟"

"جی!" میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"راستہ معلوم ہے؟" انھوں نے پوچھا اس بار ان کے لہجے میں نہ تلخی تھی نہ جھلاہٹ۔ بس ایک خوش گوار سی نرمی تھی۔

"مندر کے راستے پر ہے۔" انھوں نے کہا، "سیڑھیاں چھوڑ کر پگڈنڈی پر ہولینا۔ سیدھی وہیں جاتی ہے۔"

"اس وقت زیارت ہو سکے گی؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھ لو اگر باہر بیٹھے ہوئے تو باریابی ہوگی لیکن اندر رہوئے تو چلے آنا۔ آج کل کچھ بیمار ہیں۔"

"بیماری کیسی؟"

میرے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ جھنجھلا اُٹھے۔ انھوں نے اپنی اَدھ جلی بیڑی کو پھینک دیا، "بیماری کیسی؟ انسان کی طبیعت ہے۔ بنتی بگڑتی رہتی ہے۔"

ان کے لہجے میں مجھے متفکر کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ لیکن تھوڑی سی حیرانی ضرور ہوئی۔ اپنے خط میں انھوں نے بیماری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ کیا انھیں ڈر تھا کہ میں اپنے ساتھ ماں کو بھی لے آؤں گا۔ مجھے ان پر ہنسی آنے لگی۔ وہ ماں جو گھر کی سیڑھیاں تک نہیں

چڑھ سکتیں بس میں دھکّے کھاتی بھلا اکیس سو میٹر کی اونچائی طے کر کے یہاں آئیں گی۔

اس کے بعد میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا اور تپائی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اگھوری بابا نے کچھ تعجب سے مجھے دیکھا "کیا ابھی جا رہے ہو؟"

"جی.... اوپر پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"پوری عمر!" وہ ہنسنے لگے۔ "لیکن اگر تم بھٹکے نہیں تو آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے دکان سے اپنے تھرمس میں پانی بھروایا اور جب چائے کے پیسے دینے کے لیے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا تو پشت پر ان کی آواز سنائی دی: "تین گلاسوں کے۔ میں ایک اور لوں گا۔" میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پیسے دیے اور اوپر چڑھنے لگا۔

چڑھائی کھڑی ہتھیلی سی معلوم ہوتی تھی۔ چاروں طرف جنگل تھے لیکن سڑک پر ایک بھی سایہ دار پیڑ نہیں تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ پہاڑ پر پسینے کی دھار بہہ نکلے گی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں اس لیے مجھے بلڈ پریشر کا ڈر ہونے لگا تھا۔

بازار بہت نیچے رہ گیا تھا۔ لیکن وہاں کی آوازیں اور بس کے ہارن ایک نشیلے ترنم کی طرح سنائی دیے جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ آوازیں بھی غائب ہو گئیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ نہ جانور نہ ہوا نہ آدمی۔ اگر میں کئی کلومیٹر تک اسی طرح چلتا رہوں تو نہ میں ختم ہوں گا اور نہ راستہ۔ میں اسی طرح پسینے میں نہایا ہوا اوپر چڑھتا رہوں گا۔ نہ کچھ دیکھتا ہوا نہ کچھ سوچتا ہوا۔ لیکن اسی وقت پاؤں ٹھٹھک گئے۔ جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ اگر تم جواب دے چکے ہو تو ہمیں کوئی پروا نہیں۔

آگے ایک تراہا تھا۔ اُٹھی ہوئی ہتھیلی پر تین انگلیوں کی طرح کھلا ہوا۔ داہنی پگڈنڈی پر ایک سیاہ تختی دکھائی دی۔ جس پر سفید رنگ کا ایک تیر بنا ہوا تھا۔ اور تیر کی نوک پر لکھے ہوئے چار لفظ مجھے گھور رہے تھے۔ ٹو دی فارسٹ ریسٹ ہاؤس" اس وقت مجھے اگھوری بابا کی انگلی یاد آئی۔ خدا کی طرف اُٹھی ہوئی۔ جہاں مہاکال کا مندر تھا۔ اگر نیچے کی پگڈنڈی فارسٹ ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتی ہے تو بیچ کی سڑک ضرور مندر کی طرف جاتی ہو گی۔

میں بیچ کے راستے پر ہو لیا جو پوری طرح راستہ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک اٹھان سی تھی۔

بہت پہلے شاید وہاں سیڑھیاں رہی ہوں گی۔ لیکن اب صرف پتھر تھے۔ جن پر کائی جمی تھی اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ان پر پاؤں رکھتے ہی جوتے پھسلنے لگتے۔ ہر پتھر پر سے گزرتے ہوئے سانس رکنے لگتی۔ اور یوں محسوس ہوتا گویا وہ ایک رسی کی طرح مجھے اوپر کھینچ رہے ہوں۔ اور جب میں دوسرا قدم اُٹھاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے میں اپنی ساری عمر کا بوجھ ڈھو رہا ہوں۔ لیکن یہ بوجھ اس بوجھ کے سامنے بہت حقیر تھا جسے ڈھو کر میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ گھر کے کاغذات اور گھر والوں کے پیغام۔ انھیں ڈھوتے وقت میں خود اپنے سفر کا سندیسہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ اگر ان تک پیغام پہنچانا ہے تو میرا جانا کیا ضروری ہے؟ میں اگر سارے کاغذات اور نامہ و پیام ماسٹر صاحب کے حوالے کر کے شام کی بس سے لوٹ جاؤں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ وہ انھیں بحفاظت ان کے پاس پہنچا دیں گے۔ پھر وہ جو چاہیں کریں۔ لیکن یہاں تک آکر یوں ہی لوٹ جانا؟ وہ دس سال سے یہاں رہ رہے ہیں اور میں پہلے ہی دن اتنا مایوس ہو گیا۔ وہ بھی تو پہلے روز اسی طرح اوپر چڑھے ہوں گے لیکن اس وقت ان کی عمر بہت کم رہی ہوگی۔ مجھے اب بھی ان کی تصویر یاد ہے جو میرے والد نے (جب وہ زندہ تھے) اخباروں میں چھپنے کے لیے دی تھی۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ جسے انگریزی میں چیرفل Cheerful کہا جاتا ہے۔ اور تصویر کے نیچے بابو کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت — پلیز کم ..... لیکن نہ وہ آئے نہ اپنا پتہ بھیجا۔ اور تب اسٹیشن اور اسپتالوں کے چکر شروع ہوئے ..... ہم پولس کے ساتھ مردہ خانے میں آنے والے مُردوں میں انھیں پہچاننے کی کوشش کرتے جو ایک دن اچانک پہچان کی حدوں سے باہر نکل گئے۔

اچانک بیچ راستے میں میں ٹھٹھک گیا۔ کیا اب میں اُنھیں پہچان سکوں گا؟

ماتھے کا پسینہ بہتا ہوا آنکھوں میں جانے لگا۔ یہ پسینہ جیسے پانی کا ایک پردہ ہو جس کے پیچھے سارا جنگل جھلملا رہا تھا۔ آخر کار وہ مندر نظر آیا۔ سفید اور ٹھنڈا۔ اس کی ٹھنڈک سے میری تکان کا احساس زائل ہونے لگا۔

پسینہ ہوا میں سوکھنے لگا۔ میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ آس پاس بالکل سنّاٹا تھا۔ نہ کوئی معتقد، نہ پجاری، نہ کوئی سادھو سنیاسی۔ صرف مندر کے بغل میں بانج کے ڈولتے بازد

پر ایک لنگور بیٹھا تھا۔ اپنی گز بھر لمبی دُم کو ہلاتا ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے گھورا اور دھم سے مندر کی چھت پر کود گیا۔ دھم کی آواز کے ساتھ درخت کے ہلنے کی آواز اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جنگل کے لامحدود سنّاٹے میں جیسے میں اور وہ لنگور ایک ساتھ اس مہاکال کے پناہ گھر میں ہوں۔ کبھی کبھی جانور دیوتاؤں کی طرح اچانک ہماری دنیا میں نمودار ہو کر ہماری ساری ہچکچاہٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اس لنگور نے بھی اپنی دم سے جیسے میرے سارے شکوک رفع کر دیے ہوں۔ میں آگے بڑھا تو اچانک میرے پاؤں ہلکے ہوتے گئے۔

اس کے بعد زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ چڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ پیڑوں کے بیچ ایک صاف ستھری ہموار پگڈنڈی تھی۔ آگے پیچھے چیڑوں کا ہرا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ جھر جھر سوئیاں نیچے گرتی تھیں اور ایک خشک نشیلی بو اوپر اٹھتی تھی۔ اگھوری بابا کی بات سچ نکلی۔ سو میٹر چلنے کے بعد میں ایک کھلی سپاٹ جگہ پر نکل آیا جو گھنے جنگل میں اچانک کھل جاتی ہے۔ ایک کھلا خالی سا آنگن۔ جہاں صرف گھاس اور پتھر تھے؛ میں کچھ آگے بڑھا ہی تھا کہ بائیں طرف ایک چٹان دکھائی دی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میرے پاؤں خود بخود رک گئے۔

یہ چٹان نہیں پتھر کی ایک جھونپڑی تھی جس کی ڈھلوان چھت نیچے جھکی تھی اور جس کا اوپری حصّہ ایک گپھا کی طرح پہاڑی سے جا ملا تھا اور نچلا حصّہ زمین میں دھنسا ہوا تھا بیچ میں تین پتّھر ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے اوپر لکڑی کا دروازہ تھا۔ کسی طلسمی منظر کی طرح پہلی نظر میں جو کوئی چٹان معلوم پڑی تھی، اب ایک کوٹھری دکھائی دے رہی تھی۔ لکڑی، مٹی اور پتّھر کی عمارت جسے دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کون سا حصّہ آدمی نے بنایا ہے اور کون سا حصّہ فطرت کے ہاتھوں تشکیل پایا ہے...... کیا یہ ممکن ہے کہ وہاں کوئی رہتا ہو۔

میں اس عمارت کے قریب پہنچ گیا اور سفید پتھروں کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا دروازے کے آگے ٹھہر گیا، لکڑی کے دو پلوں پر کھلی سانکل لٹک رہی تھی اندر کوئی آہٹ تھی نہ ہلچل۔ دروازے میں بنے سوراخ سے میں نے اندر جھانکا پہلی نظر میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اندھیرے پر صرف روشنی کی ایک لکیر سی گر رہی تھی جو کہیں باہر سے آ رہی تھی لیکن اندر کوئی کھڑکی نظر نہیں آئی تب مجھے پتہ چلا کہ جس سوراخ سے میں جھانک رہا ہوں وہیں سے روشنی بھی آ رہی ہے۔

دھوپ کا میلا دھبہ جسے سورج وہاں پھینک گیا تھا اور اُٹھانا بھول گیا تھا۔ ....

وہ شاید سو رہے تھے، یا بیماری کی وجہ سے کہیں نیچے لیٹے تھے۔ ممکن ہے اُنھیں میرا خط بھی نہ ملا ہو۔ اُنھیں شاید یہ بھی نہ معلوم ہو کہ میں یہاں ہوں۔ وہ کل شام سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے کہ کس وجہ سے میرا آنا ٹل گیا ہے ..... یہ سوچا تھا کہ میرا ہاتھ سٹکنی پر جا پہنچا۔ گرم لکڑی کے دروازے پر سٹکنی ہل رہی تھی۔ یہ جنبش سٹکنی پر بے ارادہ میرا ہاتھ پڑ جانے کی وجہ سے ہوئی تھی یا اندر کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے، اب اس پر غور کرنا فضول تھا، کیونکہ دوسرے ہی لمحے زور کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ وہ مجھ سے کافی اونچائی پر کھڑے تھے اور میں ایک زینہ نیچے اتر آیا تھا جیسے ڈر سے میں ان کے سامنے نہ آنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خوف کے بجائے انھیں اچھی طرح دیکھنے کی بے قراری سے میں ایک سیڑھی نیچے اتر آیا ہوں۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار پر ٹنگی تصویر کو پورا کا پورا دیکھنا چاہتا ہو۔ لیکن اس بیچ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے اوپر کھینچ رہے ہیں جبکہ میں نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کھینچا تانی میں میرا بریف کیس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا اور گرتے ہی اس کے اندر کی ساری چیزیں باہر نکل پڑیں۔ کاغذات، خطوط، مکان کے دستاویزات سب ایک ایک کر کے باہر نکل آئے اور ہوا میں اُڑنے لگے۔ میں شرمندہ سا گھبرایا سا خود پر لعنت ملامت کرتا ہوا سیڑھی پر ہی بیٹھ گیا اور جلدی جلدی بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگا۔ وہ بھی میرے ساتھ نیچے بیٹھ گئے اور کاغذوں کو چن چن کر مجھے دینے لگے تھے اور میں جلدی جلدی بغیر دیکھے اُنھیں بریف کیس میں ٹھونسنے لگا۔ میری اس بدحواسی میں انھوں نے اپنا ہاتھ میرے اُٹھے ہوئے گھٹنے پر رکھ دیا جو نہ معلوم کب سے کانپ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ ان کے چہرے کے بجائے ان کے ہاتھوں پر گئی۔ دس سال بعد پہلی بار مجھے ان کے ہاتھ دکھائی دیے۔ کتنی دیر تک ہم اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ دھیرے دھیرے میں نے سر اُٹھایا تو وہ دکھائی دیے۔ وہی چہرہ ــ مجھے گھورتی آنکھیں۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میں نے اُنھیں ڈاڑھی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ڈاڑھی کے سفید و سیاہ بالوں میں وہ میرے بھائی

اور سنیاسی کے درمیان کوئی مانوس سے اجنبی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن گھٹنے پر رکھا ان کا ہاتھ؛ اس میں مجھے اپنا پرانا گھر دکھائی دیا۔ اور وہ سارا جما ہوا ماضی۔ جو ذرا سا چھوتے پر بوند بوند بہنے لگتا ہے۔

وہ تھوڑا سا نیچے جھکے اور سیڑھی پر رکھے بریف کیس کو اُٹھا لیا۔

"آؤ اندر بیٹھیں گے۔"

میں ان کے پیچھے پیچھے کوٹھری کے اندر چلا گیا۔

"بیٹھو۔" انھوں نے دھیرے سے میرے کندھے کو چھوا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے انھیں دیکھا۔

"ادھر۔" انھوں نے دری کی طرف اشارہ کیا اور خود دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میرے سامنے تھے اور میں ان کی کُٹیا میں۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا سفر ختم پر آن پہنچا ہے۔

"آپ کو میرا کارڈ مل گیا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن تمھیں تو کل آنا تھا۔"

"میں کل ہی آیا تھا۔ بس یہاں تین گھنٹے دیر سے پہنچی۔"

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ماسٹر جی کے یہاں۔ وہی مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔"

جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ انھوں نے ہی ماسٹر جی کو بس اسٹیشن بھیجا تھا؛ لیکن ان کے خاموش اور سپاٹ چہرے کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ ان کے چاروں طرف ایک گھیرا تھا۔ میں ان کے اتنا ہی قریب آسکتا تھا جتنا وہ آنے کی اجازت دیتے۔ کچھ دیر پہلے سینے پر ان کے لمس سے جو کچھ میرے اندر پگھلا تھا وہ صرف اوپر کی ایک سطح تھی۔ نیچے کی ساری پرتیں سوکھی پڑی تھیں۔ شاید اس خشکی سے بچنے کے لیے ہی انھوں نے سکوت توڑا۔

"یہاں آنے میں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ سیدھا چلا آیا۔ بازار میں چائے کے لیے رُکا تو ایک بابا مل گئے... انھوں نے سب کچھ بتا دیا۔"

"سب کچھ؟" ان کے چہرے پر ہلکی سی تشویش دکھائی دی۔

"اور کیا کہتے تھے؟"

"اور کچھ نہیں ....." میں نے ایک لمحے کے لیے ان کی طرف دیکھا۔ کیا آج کل آپ کچھ بیمار رہتے ہیں؟"

"انھوں نے بتایا ہوگا۔ کوئی خاص بات نہیں وہی سانس کی پرانی تکلیف ہے ان دنوں میں کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔" انھوں نے کچھ ایسے کہا جیسے بیماری کے بارے میں بتانا بیماری سے زیادہ تکلیف دہ ہو۔

"اتنی اونچائی پر رہنے کی وجہ سے تو نہیں؟"

انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمھیں یاد ہوگا کہ جب میں گھر میں تھا تب بھی یہ تکلیف برابر رہتی تھی۔"

گھر کا نام پہلی بار آیا تھا۔

کچھ دیر ان کی آنکھیں بند رہیں خاموشی ایسی تھی کہ باہر ایک تنکا بھی گرتا تھا تو اس کی آواز اندر سنائی دے جاتی تھی۔

"وہاں سب خیریت ہے؟" ان کی آواز گھر سے ان کے تعلق کو بھی ظاہر کرتی تھی اور لاتعلقی کو بھی۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"اب تو نیچے کی منزل خالی ہوگی؟"

"کیوں۔ خالی کیوں؟" فوری طور پر میں ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ "ماں رہتی ہیں۔" وہ کچھ دیر حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔ "اکیلے؟" انھوں نے کہا۔

"جی۔"

"اوپر تمھارے پاس نہیں رہتیں؟"

"جی ہاں۔ نیچے ہی رہتی ہیں۔"

وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے پچھلے دس سالوں میں گزری ہوئی باتوں کے بارے میں وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ حالانکہ میں نے خط میں سب کچھ لکھ دیا تھا لیکن انھوں نے اپنی

آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا اور میں جو سب کچھ جانتا تھا، پہلی بار ان کی نظروں سے اپنے گھر کو دیکھنے لگا اور تب مجھے ان کی حیرت کا اندازہ ہوا۔ جس عورت کے تین بیٹے ہوں وہ مکان کے ایک الگ کونے میں پڑی رہے، ایک اجنبی کے لیے اس سے زیادہ حیرت کی بات کیا ہو سکتی ہے۔

باہر درختوں کے درمیان آہٹ سی ہوئی کوئی چھت پر کودا اور دوڑتا چلا گیا۔ فرش پر مٹّی جھڑنے لگی۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کے باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی آواز سنائی دی۔ ایک بار — دو بار — پہاڑ کے سنّاٹے میں وہ اوپر اُٹھتی تھی اور پھر اپنی ہی گونج میں گم ہو جاتی تھی۔

وہ اندر آئے تو میں نے پوچھا "کون تھا"

"لنگور" وہ مسکرا رہے تھے۔ مندر سے اتر کر یہاں دھوپ کھانے آتے ہیں۔ ..... تم ابھی مندر تو نہیں گئے؟"

"نہیں، سنا ہے بہت پرانا ہے؟"

"مندر تو بہت پرانا نہیں ہے لیکن اس میں رکھی ہوئی شو کی مورتی کو بہت پرانا مانا جاتا ہے۔ وہ اسی پہاڑی پر زمین میں دھنسی ہوئی ملی تھی۔ اب تم یہاں ہو تو کسی دن دیکھنے چلیں گے۔ چائے پیو گے؟"

"آپ بنائیں گے؟"

"اور کون؟" وہ ہنسنے لگے۔ "ابھی بن جاتی ہے" وہ پردہ ہٹا کر نیچے چلے گئے۔ نیچے شاید ایک دوسری کوٹھری تھی جسے میں نے صرف باہر سے دیکھا تھا۔ باہر سے جو چٹان دکھائی دیتی تھی اسی کو دو حصوں میں کاٹ دیا گیا تھا۔ اوپر کی کوٹھری میں شاید ان کے مہمان بیٹھتے ہوں گے۔ وہاں دو چٹائیوں، ایک دری اور ایک آسن کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کوٹھری آدھی سے زیادہ کھلی تھی۔ چوکی کے پاس ہی ایک صراحی اور دھلے ہوئے پیتل کے دو گلاس رکھے تھے۔ کھڑکی کے نام پر دیوار میں ایک موکھا تھا جس میں سے اس طرف کی پیڑ کی کچھ شاخیں دکھائی دیتی تھیں۔ ..... اس کے پار پہاڑی کا ایک بھورا قطعہ تھا اور آسمان، بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ صرف سنّاٹے سنائی دیتے تھے یا کبھی کبھی ہوا کی سرسراہٹ۔ مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ

بارہ مہینے وہ اس کوٹھری میں سردی گرمی میں بالکل اکیلے رہتے ہوں گے۔ لیکن یہ محض خیال ہی تھا۔ جب ہم کسی مردہ شخص کو دیکھتے ہیں تو موت کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں یا اس شخص کے بارے میں۔ لیکن مرنے والے کی حقیقت کے بارے میں نہیں سوچتے ..... لیکن مردہ کیوں . . . . ؟ وہ تو زندہ تھے ..... میں ان کی کوٹھری میں بیٹھا تھا گو کہ مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ یہ وہی آدمی ہے جس سے ملنے کے لیے میں آیا تھا۔

پردہ ہلا اور وہ اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں تانبے کی تھالی تھی جس میں چائے کے دو گلاس رکھے تھے اور ایک تشتری میں کچھ نمک پارے تھے۔

”اس طرف بیٹھ جاؤ۔ دروازے سے ہوا آتی ہوگی۔“ انھوں نے تھالی چوکی پر رکھ دی۔

میں نے چائے کا گلاس لیا اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ بیچ بیچ میں دروازہ بول اُٹھتا تھا یوں لگتا تھا جیسے ہم دونوں دنیا کے آخری کنارے پر بیٹھے ہوں جہاں ہوا اور درختوں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ سنائی دیتا ہو۔

”چائے ٹھیک ہے؟“ ”یہاں لکڑیوں کی بو آتی ہے۔“ انھوں نے میری طرف دیکھا۔

”آپ کے پاس اسٹوو نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

تیل کا جھنجھٹ ہے۔ یہاں آسانی سے نہیں ملتا۔ صبح ٹہلنے نکلتا ہوں تو لکڑیاں چن لاتا ہوں سردیوں میں بہت کام آتی ہیں۔ نمک پارے لو۔ تمھیں تو نمکین بہت اچھا لگتا ہے۔“

میں نمک پارے کھانے لگا۔ اتنے برسوں بعد بھی انھیں یاد تھا کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ حالانکہ جب وہ گھر میں رہتے تھے تو شاید ہی کبھی ہمارا ان کا آمنا سامنا ہوتا ہو۔ وہ نچلی منزل میں ماں کے پاس رہتے تھے اور بہت کم اوپر آتے تھے۔ کبھی کبھی میرے بچے نچلے دالان میں کھیلنے چلے جاتے تو وہ ان سے ہنس بول لیتے تھے۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کہ ابھی تک انھوں نے گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا اور یہ ٹھیک ہی تھا۔ دس سال کی تاریخ۔ وہ کہاں سے پوچھتے اور میں کہاں سے شروع کرتا۔ جو وقت ہمارے ان کے درمیان گزر رہا تھا بس وہی ٹھیک تھا اور وہ گزرتا جا رہا تھا۔ دوپہر ختم ہو چلی تھی اور کوٹھری کے سامنے کے پہاڑوں پر سایہ ڈھلنے لگا تھا۔

وہی سایہ ہم دونوں کے درمیان بھی رینگ آیا تھا۔ کوٹھری کو دو حصوں میں بانٹتا ہوا۔ ایک وہ حصہ کہ جہاں وہ بیٹھے تھے۔ زرد بوجھل اندھیرے میں اور دوسرا وہ جہاں میں تھا۔ شام کی گہری تنگ روشنی میں جو آہستہ سے سینے پر اتر آئی تھی، کچھ دیر تک ہم دوپہر کی اس خاموش اور ساکت گھڑی میں یوں ہی بیٹھے رہے۔

"بچے کیسے ہیں؟" آخر کار ان کی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ میں نے سوچا کہ وہ کچھ اور پوچھیں گے لیکن وہ جب چپ رہے تو میں نے سکوت توڑا "منی اب کالج جانے لگی ہے۔"

"اور چھوٹی؟"

"وہ کافی بڑی ہو گئی ہے ..... میرے ساتھ یہاں آنا چاہتی تھی۔" میں نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں؟" انھوں نے میری طرف دیکھا۔

"اس نے پہاڑ کبھی نہیں دیکھے ..... کہتی تھی بڑے ابا وہاں کیسے رہتے ہیں؟"

"لیکن اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی ....."

"جب آپ نے گھر چھوڑا تھا؟" میں نے ان کا جملہ پورا کرنا چاہا لیکن وہ ادھورا ہی ہوا میں لہراتا رہا۔ درد کی اس گٹھلی کے ارد گرد جو برسوں پہلے بچک گئی تھی اور مردہ اذیت کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ شاید ہر اذیت اسی طرح دبی رہتی ہے

بچوں کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور جھوٹے برتن سمیٹنے لگے۔

تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ پردہ اُٹھا کر نیچے والی کوٹھری میں چلے گئے۔

میں کوٹھری کی دھندلی روشنی میں بیٹھا رہا۔ باہر اب بھی اجالا تھا کھلے ہوئے دروازے سے سب کچھ کھلا کھلا دکھائی دیتا تھا ..... پہاڑ کا نچلا حصہ اندھیرے میں ڈوب چکا تھا لیکن پشت پر اب بھی دھوپ رینگ رہی تھی۔ کوٹھری کے دامن میں کوّوں کی سیاہ قطار اپنی چیخوں سے فضا میں شور کرتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی۔

وہ اوپر آئے تو ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اسے چوکی پر رکھ کر انھوں نے میری طرف دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ کوئی بہت خاص بات۔ لیکن پس و پیش کے عالم میں وہ خاموش بیٹھے رہے۔

ان کا سر چوکی پر جھکا تھا۔ ٹمٹماتی روشنی میں وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ سفید ہوتے ہوئے بال، گردن اور کاندھوں کا ابھار۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میں انھیں نہیں بابو کو دیکھ رہا ہوں۔ جب میں بہت چھوٹا تھا اور وہ سلیٹ پر میرے سوال حل کرتے تھے تو میں سوال کو بھول کر ان کی گردن کو دیکھنے لگتا تھا۔

"کیا وہ گھر آتے ہیں؟"

"کون؟" میں کچھ سہم گیا۔ بابو؟ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ میرے بڑے بھائی کی بات کر رہے تھے جو ابھی زندہ تھے اور ایک دوسرے گھر میں رہتے تھے۔

"جی۔ آتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔"

"تم سے۔ کس لیے۔؟"

"وہ مکان بیچنا چاہتے ہیں۔ میں کاغذات پر آپ کے دستخط کرانے ہی آیا تھا۔" یہ کہہ کر میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ مجھے یہ ایک معجزہ ہی معلوم ہوا کہ جس کام کے لیے میں اتنی دور چل کر آیا تھا اسے میں نے اتنی آسانی سے کہہ دیا۔

انھوں نے چوکی سے سر اٹھایا۔ ایک پل کے لیے میرے بریف کیس کو دیکھا جو ابھی تک الگ تھلگ فرش پر پڑا تھا۔ پہلی بار ان کاغذات کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا جو کچھ دیر قبل سیڑھیوں پر اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔

"اور ماں؟" انھوں نے میری طرف آنکھیں اُٹھائیں جن میں ایک عجیب سی تھکن تھی۔ "وہ کہاں رہیں گی؟"

"کہیں بھی... جہاں وہ ٹھیک سمجھیں۔"

"اور تم؟"

"میں نے کرائے کی ایک جگہ دیکھ لی ہے۔"

"پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مکان میں تو آپ کا بھی حصّہ ہے . . . ." میں نے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس پڑے۔ "میں یہاں ہوں۔ میرا حصہ وہاں کیسے چھوٹ گیا؟"

میں خاموش انھیں دیکھتا رہا۔

"مکان بیچنا کیا بہت ضروری ہے؟" انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

"نہیں . . . . ضروری نہیں ہے، لیکن بڑے دہرہ دون میں زمین خریدنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟"

"مکان بیچ کر؟" ان کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"اور کیسے؟"

"لیکن اُسے تو بابو نے خریدا تھا۔ اس میں اپنی پنشن کے سارے پیسے لگائے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے . . . . ، لیکن بابو اب نہیں ہیں۔

"جو آدمی نہیں رہتا کیا اس کی چیزیں دوسروں کی ہو جاتی ہیں؟"

میں نے تعجب سے اُنھیں دیکھا۔ جی میں آیا کہ ان سے کہوں کہ آپ تو سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے تھے اب مکان رہے یا بکے اس کا غم کیوں؟

اچانک وہ آگے کی طرف جھکے۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے ہونٹ کھلے۔

"جانتے ہو جب بابو نے وہ مکان خریدا تھا تو تم ایم۔ اے کے آخری سال میں تھے۔ ان دنوں اس علاقے میں بجلی نہیں پہنچی تھی اور تم اوپر برساتی میں لالٹین جلا کر پڑھتے تھے۔"

"جی یاد ہے۔"

"تمھاری شادی اسی مکان کے آنگن میں ہوئی تھی۔

برساتی، چھت، آنگن۔ پتہ نہیں وہ مجھے یہ سب کیوں یاد دلا رہے تھے۔

نہیں مکان نہیں . . . . وہ شاید کچھ اور کہنا چاہ رہے تھے۔ اور میں اپنی غصّے کی شدّت میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

اچانک روشن دان میں کچھ چمکا۔ جیسے کوئی بنیلا جانور اپنی چمکیلی آنکھ سے اندر جھانک کر اندھیرے میں غائب ہو جائے۔ میں نے کچھ خوف زدہ ہو کر انھیں دیکھا . . . "کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بجلی چمکی ہے۔"

"مجھے کسی نئے وسوسے نے جکڑ لیا تھا۔ اب چلتا ہوں۔ بارش ہونے لگی تو نیچے اترنا مشکل ہوگا۔"

"تمھیں جلدی ہے؟" انھوں نے میری طرف دیکھا۔

"ماسٹر جی پریشان ہوں گے۔ میں ان سے کچھ کہے بغیر چلا آیا تھا۔"

"انھیں معلوم ہے کہ تم یہاں ہو۔" وہ ایک لمحے کے لیے رُکے اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولے۔ "آج رات رک کیوں نہیں جاتے؟"

مجھے اسی کا ڈر تھا اور میں اس کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔

"مجھے بلڈ پریشر ہے ..... اتنی اونچائی پر رہنا میرے لیے ٹھیک نہیں۔"

یہ احمقانہ عذر تھا۔ ایک بار پہاڑ پر آکر اونچا نیچا کیا دیکھنا؟ لیکن ان کے ساتھ پہاڑ پر رہنا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ رات ہم اسی کے ساتھ گزارتے ہیں جس میں روحانیت ہو یا جو بالکل اجنبی ہو۔ میرا ان کے ساتھ بیچ کا رشتہ تھا۔ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ کیا اسی لیے گھر والوں نے مجھے ان کے پاس بھیجا تھا؟

میں تھیلا سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ نیچے والی کوٹھری میں گئے اور جب اوپر آئے تو ان کے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں ٹارچ تھی۔ "اسے رکھ لو۔" انھوں نے چھتری مجھے دے دی۔ "میں تمھارے ساتھ مندر تک چلتا ہوں۔" وہ کوٹھری کی سیڑھیوں سے اترے۔ ٹارچ جلائی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے اتار دیا۔ وہ آگے آگے چلنے لگے۔ لیکن میں کچھ دیر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ ان کے ہاتھوں کا لمس ایک شکاری کی طرح میری نسوں میں دبی ہوئی کسی یاد کو ڈھونڈتا ہوا میرے بدن میں گردش کرنے لگا۔ پرانی محبت اندھیرے میں جگمگا اُٹھی .....

کیا یہ وہی ہیں جنھوں نے گھر چھوڑ دیا تھا؟

وہ ٹھٹھک گئے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگے۔

"میں نے سوچا تم پیچھے پیچھے آ رہے ہو؟"

میں چلنے لگا۔ چاروں طرف شفاف اندھیرا پھیلا تھا۔ تارے سر پر چمک رہے تھے اور ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ آسمان میں کوئی جگہ خالی نظر نہ آتی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ اتنی صاف روشن رات میں بجلی کہاں سے کڑکی۔

وہ ٹارچ جلا کر نپے تلے قدموں سے چل رہے تھے۔ روشنی کے دائرے میں درخت، جھاڑیاں، چٹانیں۔ سب دھیرے دھیرے پیچھے چھوٹتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اندھیرے میں چیختا ہوا اوپر سے گزر جاتا اور جھاڑی میں سرسراہٹ ہوتی۔ شاید یہ میرا وہم تھا جھاڑی پہلے ہلتی تھی اور پرندے کے اڑنے کی آواز بعد میں سنائی دیتی تھی۔ میرے تھیلے میں رکھے ٹفن کا کٹوردان بار بار میرے تھرمس سے ٹکراتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا۔

"میرا بریف کیس؟"

"کیا؟" وہ بھی ٹھہر گئے۔

"میں اسے آپ کی کوٹھری میں ہی بھول آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں.... کل لے لینا۔" پھر بہت ہی نرم لہجے میں پوچھا، "کیا اس میں تمھاری لکھی ہوئی کوئی چیز ہے؟"

پہلی بار انھوں نے میرے لکھنے کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ میری اس فضول اور خفیہ بیماری کو بھول چکے ہوں گے۔

"نہیں اس میں صرف جائداد کے کاغذات ہیں.... اور آپ کے لیے کچھ خط ہیں انھیں دیکھ لیجیے گا۔"

کچھ دیر تک ہم اندھیرے میں چلتے رہے۔ پگڈنڈی پر ٹارچ کی روشنی کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

"بہت دنوں سے تمھاری کوئی چیز نہیں دیکھی۔"

"لکھا نہیں۔ اخبار میں بہت کام رہتا ہے۔ آپ کے یہاں رسالے پہنچ جاتے ہیں؟"

"ماسٹر جی اسکول کی لائبریری سے کبھی کبھی کوئی چیز لے آتے ہیں.... بہت پہلے شاید تمھاری کوئی کہانی دیکھی تھی۔"

بس دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندھیرے میں چلتا رہا۔ عجیب سی شرم میں ڈوبا ہوا۔ برسوں پہلے ایک کہانی لکھی تھی اور بدقسمتی سے وہ چھپی بھی تھی بلکہ چھپوانے کے لیے ہی اسے لکھا تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں کے بارے میں نہیں تھی جو ایک دن اچانک گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، بلکہ ان لوگوں کے متعلق تھی جو کسی موڑ پر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ ماں اور بابو سوچتے تھے (ماں سے زیادہ بابو پُرامید تھے اور اس وقت وہ زندہ تھے) کہ اسے پڑھتے ہی وہ لوٹ آئیں گے... لوٹنا تو دور رہا انھوں نے بیس پیسے کا ایک کارڈ بھی نہ بھیجا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ اندھیرے میں مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے وہ میری شرمندگی بھی نہیں محسوس کر سکتے تھے۔ برسوں پہلے کی چوٹ بھولی ہوئی باتوں کو کرید کر تازہ ہونے لگی۔

”آپ... “ میں نے کہا ”آپ نے خبر تک نہیں کی۔“ یہ کہتے ہی میرا گلا رندھ گیا۔ مجھے دوبارہ شرمندگی کا احساس ہوا۔ دلی سے آتے وقت میں نے عہد کیا تھا کہ یہ بات ان سے کبھی نہیں پوچھوں گا۔ لیکن یہ بات میں نے پوچھ ہی لی اور اب یہی بات ہم دونوں کے درمیان آ پڑی تھی۔ اس جنگل بیابان میں ٹارچ کے گول نقطے پر ٹھہری ہوئی۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“ انھوں نے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ ہم آپ کو کہاں کہاں ڈھونڈتے پھرے؟“

”نہیں فائدہ کچھ بھی نہیں تھا اس پہاڑ کی خاموش چوٹی سے کیا وہ نشیب میں رہنے والے کیڑوں کی بدحواسی کا اندازہ کر سکیں گے...... اسپتالوں اور اسٹیشنوں کے چکر، پولس تھانوں کی فہرستوں میں گم شدہ لوگوں کے ناموں کی تلاش، مردہ گھروں میں جا کر مردوں کو پہچاننا، اخباروں کے اشتہار — ”خدا کے لیے چلے آؤ، ماں بیمار ہے..... “

”فائدہ؟“

”ایک لائن یہ تو لکھ سکتے تھے کہ آپ زندہ ہیں۔“

”اگر تمھیں معلوم ہو جاتا کہ میں زندہ ہوں تو کیا تمھاری تکلیف کم ہو جاتی؟“

”میں تکلیف کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“

”پھر—؟“

میں نے خود کو ٹٹولا تو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ نہ تکلیف نہ ماں کا بڑھاپا نہ اپنی ناکامیاں — یہ

سب تو دنیا کا معمول تھا۔

"پھر اتنے دنوں بعد خط بھیجنے کا کیا فائدہ تھا"، میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ کھڑے رہے۔ "ہاں بھیجنا تو نہیں چاہیے تھا۔ لیکن ..." انھوں نے اندھیرے میں ایک گہری سانس لی۔

"تمھیں کچھ لکھنے کے لیے مجھے دس سال لگے۔ میں نے سوچا کہ اب تمھیں اس سے کیا لینا کہ میں زندہ ہوں یا نہیں ..."

ان کی آواز میں ایسی مایوسانہ بے تعلقی تھی جو انسانوں میں نہیں بلکہ پیڑ، پتھر اور پانی میں ہوا کرتی ہے۔ اور جس کا رشتوں کی لہولہان اذیت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ یہ لاتعلقی کیا ان میں پچھلے برسوں کی تنہائی سے پیدا ہوئی تھی۔

میں چونک گیا۔ اندھیرے میں نیچے کہیں ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی وزنی پتھر نیچے کی طرف لڑھکتا ہوا جا رہا ہو۔

"یہ کیسی آواز ہے؟" میں نے ان کی طرف دیکھا۔

"پہاڑی جھرنا ہے۔ میں یہیں سے پانی لاتا ہوں۔"

"کافی نیچے جانا پڑتا ہوگا؟"

"نہیں، میری کوٹھری کے نیچے ہی بہتا ہے۔ کل آؤ گے تو دیکھنے چلیں گے۔"

انھیں خود پانی لانا پڑتا ہے؟ اس کا احساس ہوتے ہی نہ جانے کیوں شرم، تکان اور گذشتہ برسوں میں ان سے پیدا ہونے والی ناراضگی ختم ہو گئی۔ ہم ٹھہرے ہوئے سناٹے میں پانی کے بہنے کی آواز سنتے رہے۔ اوپر کہیں مندر کی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔ شام کی آرتی شروع ہو گئی تھی۔

"اب آپ لوٹ جائیے ... میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھا۔" انھوں نے کہا، لیکن واپسی کے لیے مڑے نہیں اور میں ان کے پہلو سے لگا کھڑا رہا۔

"تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"کیسی تکلیف؟" میں نے انھیں دیکھا۔

"ماسٹر جی کا گھر بہت چھوٹا ہے۔ تم ریسٹ ہاؤس میں کیوں نہیں آ جاتے۔"

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ ایک دو دن کی تو بات ہی ہے''

''ایک دو دن'' یہ فقرہ میرے منہ سے نکل گیا اور ہوا اور مندر کی گھنٹیوں کے درمیان اس کے الفاظ نہ جانے کتنی دیر تک گونجتے رہے۔

اس بار میں رکا نہیں، سیدھا مندر کی ڈھلان سے نیچے اترتا چلا گیا۔ آخری موڑ پر پہنچ کر پیچھے مڑا تو دیکھا کہ وہ اسی طرح کھڑے تھے جیسا میں انھیں چھوڑ آیا تھا۔۔۔ بے حس و حرکت اور اسی جگہ پر۔

نیچے موٹر روڈ پر روشنیوں کی قطار نور کی جھالر سی جھلملا رہی تھی۔ بیچ میں وہ پہاڑی شہر سفید دھند میں لپٹا سو رہا تھا۔ کیا وہ بھی سو رہے ہوں گے؟ یا اپنی کوٹھری میں اکیلے بیٹھے ہوں گے؟ تم پورے دس سال بعد ان سے ملنے آئے تھے اور ایک رات بھی ان کے ساتھ نہ رہ سکے۔ تم قلم کار ہو لیکن جب کوئی غیر معمولی سچائی نظر آتی ہے تو کنی کاٹ جاتے ہو۔ جیسے جینے کا سچائی سے اور سچائی کا لکھنے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ تینوں چیزیں پھانسیوں پر لٹکی لاشوں کی طرح الگ الگ جھولتی رہتی ہیں۔ بھاگنا ہی تھا تو ایک رات بھی کیوں ٹھہرے۔ مکان کے کاغذات پر دستخط کراتے اور اگلی بس سے لوٹ جاتے۔ اگر ایک ہی شہر میں ایک ہی رات الگ الگ چھتوں کے نیچے سونا تھا تو رکنے کا مطلب کیا تھا۔ ہمارا خاندان اور بھائی بہن آخری موقع پر پہنچ کر ہم سب بے جان ڈنٹھل کی طرح سوکھ جاتے ہیں۔ سارا خلوص راکھ اور ریت کے نیچے دب جاتا اور ہم ایک دوسرے کو اپنے حالات پر چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بے تعلقی گناہ نہیں ہے؟ کیا اسی گناہ سے ڈر کر انھوں نے گھر نہیں چھوڑا تھا؟

اس رات میں نیچے اترتا گیا۔ کھائی میں گر کر اپنی ملامتوں سے لپٹ کر سونے میں اتنا ہی آرام ملتا ہے جتنا پہاڑ کی اجلی چوٹی پر رہنے میں۔ لیکن کھائی میرے اندر تھی۔ اور جب میں ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا تو صرف ایک خواہش سلگ رہی تھی کہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر ایک غیر مرئی جیوان کی طرح اپنے بستر پر جا لیٹوں اور ساری رات وہیں گزار کر دوسرے دن دہلی روانہ ہو جاؤں۔

ماسٹر جی شاید باورچی خانے میں تھے۔ انھیں پتہ بھی نہ چلا کہ میں کب دروازہ کھول کر

اندر چلا آیا۔ اس وقت مجھ میں ماسٹرجی کا سامنا کرنے کی ہمت تھی نہ خواہش۔ میں جلدی سے کپڑے بدل کر بستر میں چھپ جانا چاہتا تھا۔ کمرے میں آگ دہک رہی تھی جب میں انگیٹھی کے قریب آیا تو مجھے اپنے اندر کی ٹھنڈ اور تکان کا احساس ہوا۔ اسی کے ساتھ تیز ہوتے ہوئے بخار کا بھی اندازہ ہوا۔ بخار اور ٹھٹھرن ایک دوسرے کے لیے اذیت بھی بنے ہوئے تھے اور ایک کی وجہ سے دوسرے کو آرام بھی مل رہا تھا لیکن اس آرام اور اذیت میں میرا حصّہ بالکل نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہی تھا۔ ہم گھریلو لوگوں کے لیے یہی سب سے بڑی ڈھارس ہے۔ سادھو، سنتوں کی طرح ہم ترکِ دنیا بھلے ہی نہ کر سکیں لیکن کچھ دیر کے لیے اپنے وجود سے نجات پا سکتے ہیں لیکن اس رات اِس نجات کو حاصل کرنا میری قسمت میں نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ باورچی خانے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ کچن کی چوکھٹ پر ماسٹرجی کھڑے تھے وہ مجھے یوں گھور رہے تھے گویا میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔ "آپ کب آئے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے..... طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اپنی صفائی میں کہا۔ وہ کچھ نرم پڑے پھر میرے بستر کے قریب آئے "میں نے آپ سے پلنگ پر سونے کے لیے کہا تھا۔ آج کل فرش میں سیلن رہتی ہے۔"

انھوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر نبض دیکھی۔ "بخار تو نہیں ہے....." ہلکی سی تکان ہے۔ میرے پاس برانڈی ہے۔ تھوڑی سی لیجیے۔ جسم میں گرمی آ جائے گی۔"

انھوں نے الماری سے چھوٹی سی بوتل نکالی اور کچن سے دو گلاس لے آئے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں روشن آگ کے سامنے ہم دونوں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے برانڈی پینے کے لیے نہیں بلکہ کسی پہاڑی دیوتا کی پوجا کرنے بیٹھے ہوں۔ باہر اندھیرے میں جنگل کے سناٹے کو چیرتی ہوئی کسی پرندے کی عجیب سی آواز سنائی دے جاتی۔ جیسے وہ ہمیں اپنی طرف بلا رہا ہو۔

"نی نیرا ہے۔ اسے سن کر بچّوں کو نیند آ جاتی ہے۔" انھوں نے برانڈی کا گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا۔ "گرم پانی چاہیے؟"

"نہیں۔ یوں ہی ٹھیک ہے..... آپ کو یہاں مل جاتی ہے؟"

"نہیں۔ یہاں کہاں ملے گی؟ کبھی کبھی المورہ یا بھوالی سے منگوا لیتا ہوں۔ بس ڈرائیور لے آتے ہیں۔"

آگ کی گرمی ہو یا برانڈی کا اثر مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی گرہیں دھیرے دھیرے کھلتی جارہی ہیں۔ کچھ دیر قبل مندر کے نیچے دکھ اور افسوس کا جو جذبہ ابھرا تھا وہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے میری روح میں جذب ہوگیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس دنیا میں کچھ بھی بُرا نہیں ہے۔ ماسٹر جی کا ایک ٹک مجھے گھورنا بھی نہیں۔ وہ عجیب سی بے چینی سے مجھے گھور رہے تھے۔

"مل آئے بابا سے؟"

پہلے تو میں کچھ نہ سمجھا۔ "کون سے بابا؟"

وہ ہنسنے لگے۔ "آپ بھی خوب ہیں۔ جیسے یہاں بہت سے بابا ہوں۔"

میں ان کے کھلے ہوئے جبڑے اور اس میں سے جھانکتے ہوئے زرد دانتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جنھیں وہ بابا کہہ رہے ہیں ان کا مجھ سے بھی کوئی رشتہ ہوسکتا ہے۔ سادھو سنتوں کا گھر بار بھی ہوسکتا ہے اس کے بارے میں کبھی کوئی سوچتا ہی نہیں۔ پہلی بار یہ بات مجھے بڑی انوکھی معلوم ہوئی۔

"کیا وہ اپنی کٹیا ہی میں تھے؟"

"جی..... بھلا اور کہاں جائیں گے۔" میں نے کچھ تعجب سے انھیں دیکھا۔

"ہر جگہ..... پہلے تو وہ ہر جگہ گھومتے تھے۔ سودا سلف لینے بھی خود ہی نیچے بازار میں آتے تھے۔"

مجھ میں تھوڑا سا اضطراب جاگا۔

"اب کہیں نہیں جاتے؟"

"کبھی کبھی مہینوں گزر جاتے ہیں ان کے دیدار نہیں ہوتے۔ پہلے میں ان کی خیریت لینے ان کی کٹیا میں چلا جاتا تھا لیکن ان کا برتاؤ کچھ ایسا تھا کہ میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔"

"کیسا برتاؤ؟"

وہ آگ کی روشنی میں اپنی ہتھیلی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے میری بات کا جواب اس

پر لکھا ہو۔ پھر انھوں نے برانڈی کا چھوٹا سا گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا۔

پچھلی سردیوں میں میں ہی ان کے لیئے پانی لے جاتا تھا۔ وہ بہت روکتے تھے لیکن میری چھٹیاں تھیں اس لیے میں ہر صبح ان کی کٹیا میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک صبح میں جھرنے سے پانی بھر کر لا رہا تھا کہ وہ مجھے راستے میں مل گئے۔ روک کر بولے: "کیا تم میرے لیے لکڑیاں چن کر لا سکتے ہو؟" "کیوں نہیں....." میں نے کہا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر مسکرا کر کہا: "اور روٹی؟ میرے لیے کھانا بھی پکا سکتے ہو؟" میں نے کہا: "نو پرابلم....." دن میں ایک بار تو کھاتے ہیں۔ بھلا آپ کی روٹی پکانے میں کتنی دیر لگے گی!" "اور میں؟" انھوں نے پوچھا۔ "میں کیا کروں گا؟" میں نے کہا: "بابا آپ اللہ سے لو لگائیے۔ اسی کے لیے تو آپ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے ہیں:" جانتے ہو انھوں نے کیا کہا؟

ماسٹر جی رک کر آگ کی لپٹوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر تک جلتی ہوئی لکڑیوں کی آواز کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔

"کیا کہا انھوں نے؟"

کہنے لگے جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اس سے کیسے لو لگائی جا سکتی ہے۔

"یہ کہا انھوں نے؟"

"اگر ایسی بات ہے تو گھر بار چھوڑ کر جنگل بسانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگے: "میں نے چھوڑا کچھ بھی نہیں میں صرف یہاں رہنے کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ میرا سب کام کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟ میں نے پانی کی بالٹی راستے ہی میں چھوڑ دی.... جو آدمی اپنی خدمت کرنا نہیں جانتا وہ اس کی خدمت کیا کرے گا؟"

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ایک لمبی سانس لی۔

"میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ نوکری کی وجہ سے۔ لیکن وہ یہاں کیوں رہتے ہیں یہ کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ نہ دھیان گیان نہ پوجا پاٹھ..... لوگ ان سے ملنے آتے ہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے ان کے منہ سے پند و نصیحت کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔"

"پھر بھی لوگ ان کے پاس آتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ آپ بھی تو آخر اتنی دور سے آئے ہیں؟"

"نام سنا تھا..... " میں نے کہا۔

"کوئی مُراد لے کر آئے ہیں یا محض تجسّس؟"

ماسٹر جی ٹٹولتے والی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے اندر جھانکا۔ پرانے جالوں میں جو چیز پھنسی تھی وہ نہ کوئی آرزو تھی نہ تجسّس ۔ صرف ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوٹے رشتے کی ایک ڈور جو کبھی ماسٹر جی سے جا ٹکراتی اور کبھی مجھ سے لیکن اسے نہ وہ سمجھ پا رہے تھے نہ میں۔

"کھانا لگاؤں، بہت دیر ہو گئی ہے۔"

ماسٹر جی باورچی خانے میں چلے گئے لیکن میں اپنے بستر پر ہی بیٹھا رہا۔ باہر جھینگروں کی آواز ایک سُر میں نکل رہی تھی۔ برانڈی پینے کے بعد ایک دھیمی سی آنچ میرے اندر بھی اُٹھنے لگی تھی۔ گھر میں تھا تو گھر گرہستی کے چکر میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ میرے اندر کتنی سردی اور تھکن جمع ہو گئی ہے۔

"آپ سو گئے؟"

میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ آگ کی ہلکی ہلکی آنچ سے گرمی پا کر میں اونگھنے لگا تھا۔ انھوں نے دو سینیاں فرش پر رکھ دیں۔ دال، سبزی، موٹی گرم روٹیاں..... سب کچھ انھوں نے ہی پکایا تھا۔ اس پل مجھے ماسٹر صاحب سے بے پناہ حسد ہونے لگا تھا۔ دو دن سے میں ان کے گھر مہمان کی طرح رہ رہا تھا اور انھیں میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ یکبارگی جی چاہا کہ انھیں سب کچھ بتا دوں۔ کہہ دوں کہ ان کے سادہ لوح بابا اور کوئی نہیں میرے بڑے بھائی ہیں جن سے ملنے کے لیے میں آیا ہوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ کہنے کی خواہش مر گئی۔ میری بات سن کر وہ کش۔مکش میں پڑ جائیں گے اور فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا..... کچھ سچائیاں غیر ضروری ہوتی ہیں۔ انھیں بتانے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"ابھی تو آپ کچھ دن یہاں رہیں گے؟" ان کی آواز میں عجیب سی تشویش تھی۔

"مجھے کل ہی جانا ہے۔" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں صرف دو دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔"

"کہاں کام کرتے ہیں آپ؟" انھوں نے پہلی بار مجھ سے میری میدانی زندگی کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان کی آواز میں ایک محبت آمیز تشویش تھی جس کی وجہ سے میں ان کا ممنون ہو گیا۔ میں نے انھیں اپنی اخبار کی نوکری کے بارے میں بتایا..... اپنے بچوں اور اپنی گھر گرہستی کے بارے میں بتایا۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا اور انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تو مجھے خفیف سا شبہہ ہوا کہ کہیں وہ سو تو نہیں رہے ہیں۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو کمرے کی زرد روشنی میں ان کی آنکھیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوا پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہے تھے؟

"ایک بات کہوں؟ آپ گھر بار چھوڑ کر اتنی دور آئے ہیں۔ کچھ دن رک کیوں نہیں جاتے؟"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"بابا کا ساتھ رہے گا اور کیا؟ وہ بھی ان دنوں کوٹھری میں اکیلے پڑے رہتے ہیں۔"

"آپ بھی تو یہاں رہتے ہیں پھر بھی ان کے پاس نہیں جاتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کیا بات کروں۔ پہلے تھوڑا بہت ان کا کام کرنے چلا جاتا تھا اب انھیں اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ پتہ نہیں دن رات اکیلے کیا کیا کرتے ہیں؟"

"انھوں نے گھر بار اپنی مرضی سے چھوڑا ہوگا۔ اور اکیلے رہنا اتنا بڑا عذاب بھی نہیں ہے..... آپ بھی یہاں بالکل اکیلے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میری بات الگ ہے۔ میں مہینے میں ایک دو بار الموڑہ کا چکر لگا آتا ہوں۔ اگر یہاں کوئی ڈھنگ کا مکان مل جاتا تو گھر والوں کو بھی یہاں لے آتا....." وہ ایک لمحے کے لیے رُکے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر دھیرے سے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کو یہاں آئے اتنے برس ہو گئے لیکن ان کے خاندان کا کوئی فرد ان سے ملنے نہیں آیا۔"

مجھے شبہہ ہوا کہ انھیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے..... شاید پہلے ہی دن سے اُنھیں معلوم تھا جب وہ بس اسٹیشن پر ملے تھے..... لیکن ان کے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

"ممکن ہے ان کے گھر والوں کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ یہاں ہیں۔"

"اتنے برسوں بعد بھی؟" انھوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو۔

"کوشش کی ہوگی ڈھونڈھ نکالنے کی..... اتنا بڑا ملک ہے کوئی کہاں تک ڈھونڈھتا

بچھڑے گا،" میں نے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اندھیرے میں باہر دیکھتے رہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے ان کا کوئی ہو ہی نہ۔ کچھ لوگ تو اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر بھی سنیاس لے لیتے ہیں۔"

"آپ نے کبھی ان سے پوچھا؟"

"اپنے بارے میں وہ اتنا ہی کہتے ہیں جتنا خدا کے بارے میں۔ کبھی کبھی تو مجھے ان کے سنیاسی ہونے پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔"

"سنیاسی نہیں تو اور کیا ہیں؟" دس سال پہلے سب کو روتا چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے اب خدا کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے؟ لیکن اس رات اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا... ماسٹر جی اپنی منجی پر لیٹ گئے اور میں پچھلی رات کی طرح اپنے بستر پر۔

لیکن گذشتہ شب کی طرح کمرے میں مکمل اندھیرا نہیں تھا۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے چاند اندر جھانک رہا تھا اور کمرے کی ہر چیز روشنی کے زرد غبار میں چمک رہی تھی۔ مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ گھر کی یاد آتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی دوسری دنیا ہے اور جب بھائی کی اندھیری کوٹھری کے بارے میں سوچتا تو محسوس ہوتا کہ وہ کوئی تیسری دنیا ہے۔ اور یہ سب دنیائیں زمین پر الگ الگ بکھری ہوئی ہیں۔ نظر تو پاس پاس آتی ہیں لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور ہیں۔ کیا ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں؟ یہ خیال ہی مجھے بڑا خوفناک لگا۔ میں نے کروٹ بدلی تاکہ اس سوال کو جھٹک کر سو جاؤں۔

اوپر آسمان میں کوّے اُڑ رہے تھے۔ لشکر کے لشکر۔ وہ چیختے ہوئے نیچے اترتے اور جہاں پناہ ملتی وہاں بیٹھ جاتے۔ درخت، چٹان، شاخیں، پگڈنڈیاں۔ ان کی کاؤں کاؤں سے بازار اور مندر کے بیچ کا آسمان تھرّانے لگتا تھا۔

یہیں بازار میں ہی تھا بس اسٹینڈ کے شیڈ کے نیچے چھوٹی سی بھیڑ جمع تھی۔ ڈھابوں کے آگے کتّے اور قلی اونگھ رہے تھے۔ ماسٹر جی سب کو ٹھیلتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ٹکٹ والی کھڑکی پر جا پہنچے۔ کھڑکی بند تھی..... ماسٹر جی نے دو تین بار اس پر گھونسے مارے۔ اچانک ایک سر باہر نکلا اور ماسٹر جی اس سے مخاطب ہوئے کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آئے۔ "پہلے سے ٹکٹ نہیں

ملتا۔ بس میں ہی ملے گا۔"

"آپ نے وقت پوچھا؟"

"شام کو ایک ہی بس دلی جاتی ہے۔ چھ بجے، دوسری آٹھ بجے۔ وہ ڈائرکٹ نہیں جاتی بھوالی سے دوسری بس لینی پڑتی ہے۔"

"چھ بجے....." وقت کافی تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے اپنا سامان باندھ لیا تھا۔ اور ماسٹر جی کی صلاح پر اسے بازار میں ان کی جان پہچان کے حلوائی کی دکان پر رکھوا دیا تھا تاکہ شام کو لوٹتے وقت اسے لینے کے لیے دوبارہ گھر نہ جانا پڑے۔ میرے ہاتھ میں صرف میرا تھیلا تھا اور ان کی چھتری۔

"آیئے ایک چائے اور ہو جائے..... آپ کو پوری چڑھائی پار کرنی ہے۔" ماسٹر جی نے کہا۔ صبح کی چائے ہم نے ان کے گھر پر ہی پی تھی لیکن ٹھنڈ اتنی زیادہ تھی کہ میرا جی چاہا کہ اس بہلتے ڈھابے میں کچھ دیر بھٹی کے سامنے بیٹھ جاؤں۔

صبح سے ہی ماسٹر جی خاموش تھے ایک دو بار مجھ سے رکنے پر اصرار کیا لیکن جب میں نے انھیں بتایا کہ کل ہی مجھے اخبار میں اپنا کالم لکھنا ہے تو انھوں نے زور نہیں دیا۔ نہ ہی سہجی بابا کے بارے میں ایک لفظ کہا۔ پچھلی رات کے بعد ہمارے درمیان ایک خاموش سمجھوتا ہو گیا تھا کہ ہم ان کے بارے میں چپ ہی رہیں گے نہ انھوں نے ان کا ذکر چھیڑا نہ میں نے کچھ کہا۔ ہمارے درمیان سے وہ کچھ اسی طرح غائب ہو گئے تھے جس طرح اونچائی پر ان کی کٹیا بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ نہ مندر دکھائی دیتا تھا نہ ڈاک بنگلہ۔ پہاڑ پر وہ ایسا دن تھا جب بارش نہیں ہوتی ہے لیکن دھوپ بھی نہیں نکلتی ہے اوپر سے نیچے تک صرف بادلوں کا ایک شامیانہ تنا رہتا ہے۔ "یہ سب بھوالی سے آتے ہیں۔" ماسٹر جی نے بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا" رانی کھیت اور نینی تال کی طرف نکل جاتے ہیں۔ نیچے کچھے ادھر آجاتے ہیں۔ یہ جگہ ان کے لیے کالے پانی کی سزا ہے۔" "اور کیا..... اور کیا؟" میں چائے پیتے پیتے رک گیا۔ "اس کے آگے نہیں جاتے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "اس کے آگے کوّے جاتے ہیں۔ دیکھتے نہیں ان کے لشکر۔"

وہ چاروں طرف موجود تھے۔ مندر کی پہاڑی پر، بازار کے اوپر چھتوں اور پیڑوں پر چکم

کاٹتے ہوئے۔

"آپ سوچیں گے اتنا چھوٹا شہر اور اتنے کوّے۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کو کسی نے بد دعا دی تھی اسی لیے یہاں کے رہنے والے مرنے کے بعد کوّے بن جاتے ہیں۔"

"پھر بھی لوگ یہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سب کوّے مرنے کے بعد نجات پا جاتے ہیں۔" ماسٹر جی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ شہر ایک طرح کا ٹرانزٹ اسٹیشن ہے۔ کوّے کی یونی اور نروان کے بیچ۔

اس بار وہ مسکرائے نہیں۔ اپنی ویران آنکھوں سے دھند میں ڈوبتے شہر اور اس پر پھڑپھڑاتے کالے ڈینوں کو دیکھتے رہے۔ کالے پانی کا شہر۔ مجھے یہ سوچ کر کچھ عجیب سا لگا کہ بھوالی کے بادل یہاں تک آتے ہیں، آگے نہیں جاتے۔ جیسے یہ دنیا کا آخری کنارہ ہو۔ مردہ روحوں اور کوّوں کا علاقہ۔

اس کے آگے کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ ماسٹر جی نے بھی اپنی مزاحیہ داستان کو طول نہیں دیا۔ وہ بھی شاید اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگے جو آدھی سے زیادہ اسی شہر میں گزری تھی۔ انھوں نے مجھے چائے کے پیسے بھی نہیں دینے دیے۔

"میں شام کو اسی ڈھابے کے سامنے رہوں گا۔ آپ ذرا جلدی آجایئے گا۔ اور ..." وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکے "ان سے میرا سلام کہیے گا۔"

"آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔" میں نے اصرار کیا۔ میں اس بار ان کے پاس اکیلے نہیں جانا چاہتا تھا۔ میری بات سن کر وہ گھبرا سے گئے۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں تو یہیں رہتا ہوں، کسی بھی دن چلا جاؤں گا ...... آپ روز روز تھوڑی آتے ہیں۔" وہ جلدی سے مڑ گئے اور بازار کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔

چڑھائی پر کیچڑ تھی۔ اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ دوپہر سے ہی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ میں نے ان کی چھتری کھول لی اور تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔ مندر کی سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے میری سانس پھول گئی۔ ایک بار جی چاہا کچھ دیر وہیں بیٹھ کر سستا لوں۔ ان کے پاس اس طرح ہانپتے کانپتے جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ پھر خیال آیا کہ اگر شام کی بس پکڑنا ہے تو جتنا وقت بھی ان کے

پاس گزار لوں اچھا ہے۔ دو چار منٹ سیڑھیوں پر دم لے کر میں دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔

پگڈنڈی کے نیچے انگریزوں کے زمانے کی ایک خوبصورت پہاڑی جھونپڑی تھی۔ ایک لمحے کو یقین نہ آیا کہ وہاں مشتبہ لوگ رہتے ہوں گے۔ جن کا اگھوری بابا کے ننگے پن، بھائی صاحب کی کٹیا اور ماسٹر جی کے اکیلے پن سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کبھی کسی کھلے دروازے سے اندر کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ سلگتی ہوئی لکڑیاں ..... کہیں گلیارے میں لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں، ریڈیو کی موسیقی؛ یہ وہی دنیا تھی جس کی محفوظ چہار دیواری میں میں نے اپنے چالیس سال گزارے تھے۔ لیکن باہر دھند میں ٹھٹھرتی ہوئی وہ دنیا کتنی بیگانی جان پڑتی تھی۔ اچانک ایک ہلکے سے خوف نے مجھے جکڑ لیا کہ اگر کوئی مجھے اس خوبصورت اور محفوظ دنیا سے باہر پھینک دے تو میرا کیا حال ہوگا۔ میں اس ٹڈی کی طرح اندھیرے میں چکر لگاتا رہوں گا۔ جسے چٹکی سے پکڑ کر ڈرائنگ روم کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور جو دوبارہ اندر آنے کا راستہ نہیں ڈھونڈھ پاتی۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے خوف پر ہنسی آنے لگی۔ میں نے اپنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس میں میرے بنک کی پاس بک تھی۔ گلے میں پڑے اس مفلر کو چھوا جسے پچھلی سالگرہ کے موقع پر میری بیوی نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ میرے چمڑے کے بٹوے میں میرے دونوں بچوں کی تصویریں تھیں۔ دلّی میں میرا مکان تھا، کتابیں تھیں جن پر میرا نام لکھا تھا۔ یہ سب ٹھوس ثبوت تھے۔ جن سے میرا اس زمین پر ہونا ثابت ہوتا تھا۔ میں وہی تھا جو چالیس سال پہلے اس دنیا میں آیا تھا۔ ایک ذی روح ایک مستقل وجود جس میں کوئی شگاف نہیں تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ یہ ذی روح مجھے ایک دن ایک آوارہ پتنگے کی طرح اندھیرے میں چھوڑ کر غائب ہو جائے گا۔ میں جلدی جلدی ان کی کٹیا کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک عجیب سی خوشی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ چند گھنٹوں بعد شام کی بس سے میں اپنی جانی پہچانی دنیا میں لوٹ جاؤں گا۔ خوف کی کوئی وجہ نہیں۔

ان کی کوٹھری میں روشنی دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی۔ روشنی زیادہ نہیں تھی بس اتنی جتنی ایک دھندلی دوپہر میں لالٹین سے باہر آتی ہے۔ میرے لیے اتنی ہی روشنی کافی تھی۔ تقریباً دوڑتا ہوا میں کٹیا کی تین سیڑھیاں چڑھ گیا۔ زنجیر کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بیچ ہی میں ٹھٹھک گیا کیا اندر ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ پھر ان کی آواز سنائی دی ایسی آواز جو نہ تو ایک

آدمی کی معلوم ہوتی تھی نہ اس کے ساتھ کوئی دوسری آواز شامل تھی۔ یہ آواز ویسی ہی تھی جیسے کوئی نیند یا بخار میں بڑبڑاتا ہے جس میں آدھے لفظ سنائی دیتے ہیں آدھے اوپر سے نکل جاتے ہیں۔ کیا وہ عبادت کر رہے تھے یا خود سے باتیں کر رہے تھے؟ اور اسی وقت وہ نظر آ گئے، میری نگاہ کی زد پر روشن دان کے سامنے دروازے کے دونوں پلّوں کے بیچ وہ کھڑے تھے۔

آج بھی وہ منظر میں بھول نہیں پاتا۔ اسے منظر کہنا غلط ہوگا۔ دروازے کے سوراخ سے جھانکا تو وہاں ہیجی بابا تھے نہ میرے بھائی، وہاں ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو دین و دنیا سے بے خبر اپنے آپ سے ہمکلام تھا اور بیچ بیچ میں خود ہی ہنسنے لگتا تھا۔ دروازے سے لگا پریشاں حال سا میں انھیں دیکھتا رہا۔ ایک بے حواس جانور سا جو خوف اور چاہ کے درمیان بت کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ لیکن میرا دوسرا حصّہ مجھے کٹ کر ان سے جا ملا تھا اور حیرت سے چیخ رہا تھا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟ کس پر ہنس رہے ہیں؟

کہتے ہیں جب روح خاموش ہو جاتی ہے تب دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سناٹے میں خون سن سناتا ہے اور اس وقت ہم ہوش میں آ جاتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکن کو پہلی بار سنتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میں نے زنجیر کھٹکھٹائی اور کب انھوں نے دروازہ کھولا۔ مجھے تو اپنے شانے پر ان کا ہاتھ اور ان کے لفظ ایک ساتھ سنائی دیے۔

‘‘کہاں رہے؟ میں صبح سے تمھارے انتظار میں بیٹھا تھا۔’’

ان کی آواز اتنی نرم اور دھیمی تھی کہ بے اختیار میری نظر ان کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ کیا یہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے اکیلے میں ہنس رہا تھا۔

‘‘آپ؟’’ میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کسی نے میرے اندر قفل لگا دیا۔ آنکھیں موند کر میں نے گزری ہوئی زندگی میں بہت سے دروازے بند کئے ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔

‘‘آپ کا ہاتھ بہت گرم ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘طبیعت ٹھیک ہے؟’’ انھوں نے دھیرے سے میرا ہاتھ اپنے شانے سے الگ کر دیا پھر یوں گویا ہوئے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ ‘‘باہر سردی ہے۔ اندر چلے آؤ۔’’

میں نے ان کی چھتری کونے میں رکھ دی۔ اور جوتے اتار دیے۔ اندر بھی اتنی ہی سردی تھی جتنی باہر۔ کھلے کمرے میں لالٹین کی روشنی اور بھی زیادہ ٹھنڈی اور دھندلی معلوم ہوتی تھی۔

"اتنی دیر کہاں رہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ماسٹر جی کے ساتھ بازار آیا تھا۔ بس میں سیٹ محفوظ کرانا تھی۔"

وہ چپ رہے۔ لالٹین کی روشنی میں ان کا سفید چہرہ، سلیٹی داڑھی اور گھنی کالی بھویں ایک بے رونق چہرے میں سمٹ گئی تھیں۔ ایک تپتا چہرہ۔ جو نہ خوش گوار تھا نہ کٹھور، جذبات سے عاری بس مجھے تک رہا تھا۔

"آج صبح ٹہلتا ہوا میں ڈاک بنگلے گیا تھا۔ اس کے منیجر مجھے جانتے ہیں..... وہ آسانی سے ایک کمرہ تمھارے لیے بک کرا سکتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"تم کچھ دن یہاں آرام سے رہ سکتے ہو۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

ان کی آواز میں خاصا اصرار تھا اور تھوڑی سی بے تپاک محبت جو محسوس نہیں ہوتی تھی اسی لیے اسے انگیز کرنا اور بھی تکلیف دہ اور دشوار معلوم ہوتا تھا۔

"آپ کو اچھا لگے گا؟" میں نے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "تم صرف میرے لیے ہی رکنا چاہتے ہو!"

"اور یہاں کون ہے؟ میں تو آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔"

"نہیں۔ میں نے سوچا شاید تم کچھ دن اپنے طور پر یہاں رکنا چاہو۔ دلّی میں تو تمھیں رہنا ہی ہے۔"

آپ سچ مچ ایسا ہی چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرے چاہنے کی بات نہیں....." وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے پھر دھیرے سے کہا۔ "عرصے سے تم نے چھٹی نہیں لی۔ تم چھٹی سمجھ کر ہی یہاں رہ سکتے ہو۔"

"وہ سوچیں گے میں بھی آپ ہی کا جیسا ہو گیا ہوں۔ گھر میں کیا ایک سنیاسی کافی نہیں ہے؟"

وہ مسکرانے لگے۔ کیا وہ مجھے سنیاسی سمجھتے ہیں؟ میں تو یہاں ویسے ہی رہتا ہوں جیسے گھر میں

رہتا تھا.... صرف جگہ بدل گئی ہے۔

"اور آپ؟ آپ بالکل نہیں بدلے۔" میں نے کچھ تعجب سے انھیں دیکھا۔

"تم کیا سوچتے ہو؟" ان کی آنکھوں میں عجیب سی شرارت چمک رہی تھی۔

"میں نے سوچا تک نہیں تھا کہ آپ کو اس زندگی میں کبھی دیکھ سکوں گا۔"

"اس زندگی میں؟" انھوں نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ "اس کے علاوہ دوسری زندگی کون سی ہے؟"

"کیا وہ میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟" لیکن ان کی آنکھیں سپاٹ تھیں اور چہرے پر اداس سی خود رفتگی ابھر آئی تھی۔

"اگر ایک ہی زندگی ہے تو جگہ بدلنے سے بھی کیا فائدہ۔ جیسے یہاں ویسے وہاں۔" میں نے کہا۔

"فائدہ ہے..... وہاں دوسروں کے لیے میرے کوئی معنی نہیں تھے۔"

"اور یہاں؟"

"یہاں دوسرے نہیں ہیں۔" وہ مسکرانے لگے۔ "اسی لیے اپنے فائدے کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔"

"کیا دوسروں کو بالکل چھوڑ دینا ممکن ہے؟"

وہ کچھ سوچنے لگے۔ دوپہر کی میلی روشنی میں ان کا سر چوکی پر ٹھہر سا گیا تھا۔ صرف بالوں کی سفید لٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے جس چہرے کو ہنستے دیکھا تھا وہ اب ایک اندھیری باؤلی پر ٹھٹکا ہوا سایہ نظر آتا تھا۔

"نہیں ممکن نہیں ہے۔" انھوں نے کہا۔ "تبھی تو میں نے تمھیں خط بھیجا تھا۔ سنیاسی ہونے کے لیے صرف چھوڑنا ہی کافی نہیں تھا۔"

وہ دیوار سے پیٹھ لگائے تھوڑا جھک گئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ دروازے کا پلّہ دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ ہوا باہر کے خس و خاشاک کو اڑا کر اندر لے آتی تھی۔

اچانک انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"کوئی آیا تھا؟" انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں،" میں نے کہا۔ لیکن اسی وقت باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کچھ لوگ سیڑھیوں کے نیچے کھڑے تھے۔

"ذرا دیکھو کون ہے؟" انھوں نے میری طرف دیکھا۔ میں اُٹھ کر دہلیز کے پاس آیا اور دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ تین چار مشتبہ سے لوگ کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ایک صاحب آگے بڑھے۔ "کیا بابا اندر ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی مجھے اپنی پشت پر ان کی آواز سنائی دی۔ "آپ باہر بیٹھیے میں آتا ہوں۔"

ان کی آواز سنتے ہی سب دست بستہ ہو گئے۔ میں الگ ہٹ گیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترے تو ہر شخص نے آگے بڑھ کر ان کے پیر چھوئے۔ سب سے بعد میں کالی شال میں لپٹی ہوئی ایک بہت کم عمر لڑکی آئی۔ ایک لمحے کے لیے بابا کو دیکھا پھر بہت دیر تک ان کے پیروں کے پاس سر جھکائے بیٹھی رہی۔

وہ بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ نہ ایک لفظ کہا نہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا دی۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف مڑے اور کہا "تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔" ان کے چہرے پر عجیب سا تذبذب تھا۔ میں نڈھال سا کھڑا رہا۔ کیا ان لوگوں کے سامنے انھیں مجھ سے شرم آ رہی تھی؟

میں اندر آیا۔ لالٹین کی لو کم کی۔ صرف اتنی روشنی رہنے دی کہ باہر کا ہلکا اُجالا اندر آتا رہے۔ وہ کٹیا کے باہر بانج کے نیچے ایک سفید چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی رک رک کر ان میں سے کسی کی آواز اندر آ جاتی تھی۔ جیسے وہ بابا سے کچھ کہہ رہے ہوں۔ لیکن ان کی آواز ایک بار بھی سنائی نہیں دی۔ اور تب مجھے اپنے سوال پر شرم آنے لگی۔ دوسرے لوگ؟ انھوں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہ لوگ؟ انھیں ان سے کیا ملتا ہوگا۔ جو یہاں آتے ہیں۔ کچھ تو ضرور ہوگا جس کا مجھے علم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کے روپ میں ایک اجنبی سے مل رہا تھا اور ان سے وہ سب باتیں پوچھ رہا تھا جو اس وقت بالکل بے معنی تھیں۔ مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا جب میں انھیں ڈھونڈنے اسپتال کے مردہ گھر میں گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ چبوترے کے باہر جو لوگ ان کے دیدار کے لیے آئے ہیں میں بھی اُنھیں کی قطار میں کھڑا

ہو گیا ہوں۔ لیکن وہ کوئی دوسری جگہ تھی، کوئی دوسرا وقت۔ وہاں سفید چبوترے کی جگہ برف کی سلیں رکھی تھیں جن پر لوگوں کی لاشیں مچھلیوں کی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ میں ہر سل کے آگے رک جاتا تھا کیا یہی ہیں وہ۔ لیکن ہر بار جب میں رکتا تو مردہ گھر کا محافظ مجھے پیچھے سے دھکا دے دیتا۔ جلدی کیجیے آپ ہی کے نہیں دوسروں کے مردے بھی پڑے ہیں۔ پہچانیے اور آگے بڑھیے ..... دوسروں کے مردے، میں دھکے کھاتا ہوا آگے بڑھ گیا ..... دس سال آگے ..... فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ برف کی سل پر لیٹا ہوا میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ یا وہ اوپر سے جھکے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

"چھوٹے!"

ایک دھیمی سی آواز سنائی دی۔ میرے سر پر کوئی لالٹین تھی اور وہ مجھے آواز دے رہے تھے۔ دس سال بعد ان کے منہ سے گھر کا نام سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں لگا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھنے لگا جو مجھے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔

"تم سو گئے تھے؟" انھوں نے دھیرے سے کہا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اوپر ان کا کمبل پڑا ہوا ہے۔

"وہ لوگ چلے گئے؟" میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کب کے ....."

"آپ یہ کمبل کب ڈال گئے؟"

"جب میں اندر آیا تھا تم ٹھٹھر رہے تھے جیسے برف پر لیٹے ہو۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"برف پر؟" مجھے محسوس ہوا کہ میں دس سال پرانے خواب سے باہر نکل آیا ہوں۔ کوٹھری میں ہلکی زرد روشنی پھیلی تھی۔ ڈوبنے سے پہلے سورج ابھر آیا تھا اور ایک زرد سی چمک پہاڑوں پر اتر آئی تھی۔

وہ میری طرف جھکے اور بڑی نرم آواز میں کہا۔ "تھوڑا آرام کر لو۔ ابھی چائے بنا لاتا ہوں۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہی خاموش چہرہ اور مختصر سی مسکراہٹ جیسے وہ ابھی ابھی برف کی سِل پر سے اُٹھ کر باہر آئے ہوں۔ باہر اُجالے میں جہاں ان کی دنیا میرے ماضی سے مل گئی تھی۔ شام کے ان لمحوں میں میرا ان کو دیکھنا اور ان کا چپ رہنا بالکل اسی طرح تھا گویا ہم نے گذشتہ برسوں کے خاموش اور طویل فاصلوں کو ایک ہی لمحے میں طے کر لیا ہو۔ شاید اسی لیے انھوں نے مجھے بلایا تھا۔ آخری بار مجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے۔

میں آہستہ سے اُٹھا اور ان کا کمبل تہہ کر کے کونے میں رکھ دیا پھر ڈیوڑھی پر آیا جوتے پہنتے اور تھیلا اُٹھا کر اُنھیں دیکھا۔ وہ اب بھی لالٹین لیے کھڑے تھے۔ حالانکہ اب روشنی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"میں چلوں گا۔ بس جانے والی ہو گی۔"

وہ چپ کھڑے رہے۔ پھر دھیرے سے کہا۔ "ٹھہرو ابھی آتا ہوں۔"

وہ نیچے کے کمرے میں گئے۔ اور جب اوپر آئے تو ان کے ہاتھ میں لالٹین نہیں تھی۔

"تم اسے پھر بھول گئے۔" انھوں نے میرا بریف کیس مجھے لوٹاتے ہوئے کہا۔ "خط میں نے رکھ لیے ہیں اور ....." وہ ایک لمحے کے لیے رُکے پھر آہستہ سے کہا۔ "کاغذوں پر دستخط کر دیے ہیں۔ تم دیکھ لینا۔"

میں نے انھیں دیکھا وہ تھوڑا سا جھک گئے تھے۔ باہر پیڑوں سے چھنتی ہوئی دھوپ ان کے پیروں پر آ رہی تھی۔ میں بھی جھک گیا اور کچھ دیر اسی طرح جھکا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ ایک لمس جو دھیرے دھیرے میرے جسم کو گرما رہا تھا۔

سر اُٹھایا تو کوٹھری میں کوئی نہیں تھا۔ بانج کے پیڑ کا سایہ روشندان سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اور جہاں وہ کھڑے تھے وہاں دھوپ کا ایک دھبہ خاموشی سے پھیل گیا تھا۔ میرے سفر کو شاید اسی طرح ختم ہونا تھا۔

میں نے بریف کیس اُٹھایا اور باہر چلا آیا۔

میں پیڑوں کے بیچ دھوپ میں ڈھلی پگڈنڈی سے اترنے لگا۔ وہ کتنی نیچے تک چلی گئی تھی۔ دلی شہر میرے دوست، اخبار کا دفتر، گرمی کی سنسان لو بھری دوپہریں اور میری بچّی

جھوٹی کہانیاں..... میں دھیرے دھیرے اس اونچائی کو بھول گیا جہاں ان سے، ماسٹر جی سے اور اگھوری بابا سے ملا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے بس اڈّے تک چھوڑنے آئے تھے۔ ان کے چہرے وقت کے ساتھ دھندلے پڑ گئے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں ماسٹر جی کا سوال اچانک کوند جاتا ہے۔ بس کی کھڑکی سے لگ کر انھوں نے بڑے تجسّس سے پوچھا تھا، "آپ جو مراد لے کر ان کے پاس گئے تھے کیا وہ پوری ہو گئی؟" اس سے پہلے کہ میں اس کا کوئی جواب سوچتا بس چل پڑی۔ ماسٹر تو کچھ دور تک بس کے ساتھ ساتھ چلے لیکن اگھوری بابا مجھ سے لاتعلق اوپر دیکھتے رہے۔ پیڑوں کے اوپر ہوا میں گھومتا ہوا ایک بھنور اُٹھ رہا تھا — اور ہزاروں کوّے جنگل کا چکر کاٹتے ہوئے مندر کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔

ایک دن کا مہمان

اس نے اپنا سوٹ کیس دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ مکان میں سناٹا تھا۔ کسی طرح کی آواز نہیں تھی۔ ایک لمحے کو گمان گزرا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے اور وہ خالی مکان کے آگے کھڑا ہے۔ اس نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور اپنا ایئر بیگ سوٹ کیس پر رکھ دیا۔ دوبارہ دستک دی اور دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ بزآمدے کے پیچھے ایک کھلی کھڑکی ہوا میں جھول رہی تھی۔

وہ پیچھے ہٹ کر اوپر دیکھنے لگا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس گلی کے دوسرے مکانوں کی طرح۔ کالی چھت۔ انگریزی کے وی کی شکل میں۔ دونوں طرف سے ڈھلواں اور بیچ میں سفید پتھر کی دیوار، جس کی پیشانی پر مکان کا نمبر ایک کالی بندی سا چمک رہا تھا۔ اوپر کی کھڑکیاں بند تھیں اور پردے گرے ہوئے تھے۔ کہاں جا سکتے ہیں اس وقت؟

وہ مکان کے عقب میں گیا وہاں وہی لان، خاردار تار اور جھاڑیاں تھیں جو اس نے دو سال پہلے دیکھی تھیں۔ بیچ میں ولو اپنی ٹہنیاں جھکائے ایک کالے بوڑھے ریچھ کی طرح اونگھ رہا تھا۔ لیکن گیراج کھلا اور خالی پڑا تھا۔ وہ کار لے کر کہیں باہر گئے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے پوری صبح اس کا انتظار کیا ہو اور اب کسی کام سے باہر چلے گئے ہوں۔ لیکن دووازے میں اس کے لیے ایک چٹ تو لگا ہی سکتے تھے۔

وہ دوبارہ سامنے کے دروازے پر لوٹ آیا۔ اگست کی چلچلاتی دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ برآمدے ہی میں اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ سڑک پار کے مکانوں کی کھڑکیوں سے کچھ چہرے جھانک رہے ہیں۔ اس نے سنا تھا کہ انگریز دوسروں کی ذاتی پریشانیوں میں دخل نہیں دیتے۔ لیکن وہ مکان کے باہر برآمدے میں بیٹھا تھا جہاں پرائیویسی کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس لیے وہ بلاجھجک دیدہ دلیری سے اسے گھور رہے تھے۔ لیکن ان کے تجسس کی ایک دوسری وجہ تھی۔ انگلستان کے اس چھوٹے سے قصباتی شہر میں لگ بھگ سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور وہ اپنی شکل وصورت اور اپنے ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی سوٹ میں ایک انوکھا شخص دکھائی دے رہا ہوگا۔ اس کے ملے ہوئے لباس گرد آلود اور پسینے سے تر چہرے کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابھی تین دن پہلے فرینک فرٹ کی کانفرنس میں اس نے مقالہ پڑھا تھا۔ میں ایک پریشان حال ایشین تارکِ وطن دکھائی دے رہا ہوں گا ..... اس نے سوچا اور اک دم کھڑا ہو گیا۔ جیسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا زیادہ آسان ہو۔ اس بار بغیر سوچے سمجھے اس نے دروازہ زور سے کھٹکھٹایا اور فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہاتھ لگتے ہی دروازہ کھل گیا۔ زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چوکھٹ پر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا کہ تم اندر تھیں اور وہ کہتی کہ تم باہر کھڑے تھے؟ اس نے اپنے گرد آلود ہاتھوں سے اپنے کمزور شانوں کو پکڑ لیا۔ لڑکی کا سر جھک گیا اور اس نے اپنا مُنہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔

پڑوسیوں نے ایک ایک کر کے اپنی کھڑکیاں بند کر دیں۔

لڑکی نے آہستہ سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ باہر کب سے کھڑے تھے؟

"پچھلے دو سال سے۔"

"واہ!" لڑکی ہنسنے لگی۔ اسے اپنے باپ کی ایسی ہی باتیں احمقانہ معلوم ہوتی تھیں۔

"میں نے دو بار گھنٹی بجائی۔ تم لوگ کہاں تھے؟"

گھنٹی خراب ہے اسی لیے میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

"تو مجھے فون پر بتانا چاہیے تھا۔ میں ایک گھنٹے سے آگے پیچھے چکّر لگا رہا تھا۔

میں تمھیں بتانے والی تھی لیکن بیچ میں لائن کٹ گئی ..... تم نے اور پیسے کیوں نہیں بھیجے۔"

"میرے پاس صرف دس پیسے تھے ..... وہ عورت بڑی چڑیل تھی۔"

"کون عورت؟" لڑکی نے اس کا بیگ اٹھایا۔

"وہی جس نے فون بیچ میں کاٹ دیا۔"

آدمی اپنا سوٹ کیس بیچ ڈرائنگ روم میں گھسیٹ لایا۔ لڑکی بے چینی سے بیگ کے اندر جھانک رہی تھی۔ سگریٹ کے پیکٹ، اسکاچ کی لمبی بوتل، چاکلیٹ کے بنڈل۔ وہ ساری چیزیں جو اس نے انتہائی عجلت میں فرینک فرٹ ایرپورٹ کی ڈیوٹی فری دکان سے خریدی تھیں، بیگ سے باہر جھانک رہی تھیں۔

"تم نے اپنے بال کٹوا لیے؟" آدمی نے پہلی بار اطمینان سے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں۔ صرف چھٹیوں بھر کے لیے۔ کیسے لگتے ہیں؟"

"اگر تم میری بیٹی نہ ہوتیں تو میں سمجھتا کوئی لفنگا گھر میں گھس آیا ہے۔"

"اُف پاپا!" لڑکی نے ہنستے ہوئے بیگ سے چاکلیٹ نکالی۔ اس کا کاغذ الگ کیا اور باپ کی طرف بڑھا دی۔

سوئس چاکلیٹ۔ اس نے چاکلیٹ والا ہاتھ ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔

میرے لیے ایک گلاس پانی لا سکتی ہو؟

ٹھہرو۔ میں چائے بناتی ہوں۔

"چائے بعد میں..." وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ نوٹ بک، بٹوہ، پاسپورٹ۔ سب چیزیں باہر نکل آئیں۔ پھر اسے گولیوں کا وہ ڈبہ ملا جسے وہ ڈھونڈھ رہا تھا۔

لڑکی پانی کا گلاس لے آئی تو اس سے پوچھا۔ "کیسی دوا ہے؟"

"جرمن۔" اس نے کہا۔ "بہت جلد اثر کرتی ہے۔" اس نے گولی پانی کے ساتھ نگل لی۔ پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ وہی کمرہ، شیشے کا دروازہ، کھلے ہوئے پردوں کے بیچ وہی چوکور ہرے رومال جیسا لان۔ ٹی وی کے اسکرین پر اڑتے ہوئے پرندوں کی پرچھائیں۔ جو اڑتے تو باہر تھے لیکن گمان گزرتا تھا کہ اندر اڑ رہے ہیں۔

وہ کچن کی چوکھٹ پر آیا۔ گیس کے چولھوں کے پیچھے لڑکی کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ کارڈرائے کی کالی جینس اور سفید قمیض جس کی مڑی ہوئی آستینیں کہنیوں پر جھول رہی تھیں۔ وہ بالکل چھوٹی موٹی

سی معلوم ہو رہی تھی۔

"ماما کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ لڑکی نے نہیں سنی لیکن اسے محسوس ہوا جیسے لڑکی کی گردن کچھ اوپر اُٹھی ہو۔ "ماما کیا اوپر ہیں؟" اس نے دوبارہ کہا اور لڑکی ویسے ہی بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اور تب اسے معلوم ہوا کہ اس نے پہلی بار بھی اس کے سوال کو سن لیا تھا۔ "کیا وہ باہر گئی ہیں؟" لڑکی نے بہت دھیمے اور ایسے انداز میں سر ہلایا جس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"پاپا تم کچھ میری مدد کرو گے؟"

وہ لپک کر کچن میں چلا آیا۔ "بولو کیا کام ہے؟"

"تم چائے کی کیتلی لے کر اندر جاؤ میں ابھی آتی ہوں۔"

"بس؟" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا، پیالے اور پلیٹیں بھی لیتے جاؤ۔"

وہ سب چیزیں لے کر اندر کمرے میں چلا آیا۔ وہ دوبارہ کچن میں جانا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے ڈر سے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا۔ کچن سے کسی چیز کے تلے جانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ لڑکی اس کے لیے کچھ بنا رہی تھی اور وہ اس کی کوئی بھی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک بار جی چاہا کہ کچن میں جا کر اسے سمجھا کر لے آئے کہ وہ کچھ نہیں کھائے گا لیکن دوسرے ہی لمحے بھوک نے اسے دبوچ لیا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بوسٹن کے چائے خانے میں اتنی لمبی لائن لگی تھی کہ وہ ٹکٹ لے کر سیدھا ٹرین میں آ بیٹھا تھا۔ سوچا تھا کہ ڈائننگ کار میں کچھ پیٹ میں ڈال لے گا۔ لیکن وہ دوپہر سے پہلے نہیں کھلتی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو اس نے آخری بار کل شام کو فرینک فرٹ کے ائرپورٹ میں کھانا کھایا تھا۔ اور جب رات کو لندن پہنچا تھا تو اپنے ہوٹل کی بار میں پیتا رہا تھا۔ تیسرے گلاس کے بعد اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی، نمبر دیکھا اور بار کے ٹیلی فون بوتھ میں جا کر فون ملایا تھا....

پہلی بار میں پتہ نہیں چلا کہ اس کی بیوی کی آواز ہے یا بچی کی۔ اس کی بیوی تے فون اُٹھایا ہو گا کیونکہ کچھ دیر تک فون کا سناٹا اس کے کان میں جھنجھناتا رہا تھا۔ پھر اس نے سنا کہ وہ اوپر سے بچی کو بلا رہی ہے اور تب اس نے گھڑی دیکھی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اس وقت وہ سو رہی ہو گی۔ وہ فون رکھ دینا چاہتا

تھا لیکن اسی وقت اسے بچی کی آواز سنائی دی۔ وہ آدھی نیند میں تھی۔ اسے کچھ دیر تک پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ انڈیا سے بول رہا ہے یا فرینک فرٹ سے یا لندن سے۔۔۔ وہ اسے اپنے بارے میں بتا ہی رہا تھا کہ تین منٹ ختم ہو گئے اور اس کے پاس اتنی ریزگاری بھی نہیں تھی کہ رابطے کو منقطع ہوتے سے بچا لے لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ نیند، گھبراہٹ اور نشے کی حالت میں بھی یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ کل ان کے شہر پہنچ رہا ہے۔۔۔۔۔ کل یعنی آج۔

وہ خوش گوار لمحے تھے۔ باہر انگلستان کی زرد اور ملائم دھوپ پھیلی تھی۔ وہ گھر کے اندر تھا اور اس کے اندر گرم گرم لہریں اُٹھنے لگی تھیں۔ ہوائی اڈوں کی بھاگ دوڑ، ہوٹلوں کی حیل حجت، ٹرین ٹیکسیوں کا شور شرابہ ــ وہ سب سے دور ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں تھا۔ اپنا گھر نہ سہی پھر بھی ایک گھر ــ کرسیاں، پردے، صوفہ، ٹی وی۔ وہ عرصہ سے ان چیزوں کے بیچ رہ رہا تھا اور ہر چیز کی تاریخ کو جانتا تھا۔ ہر دو تین سال بعد جب وہ آتا تھا تو سوچتا تھا کہ بچی کتنی بڑی ہو گئی۔ اور بیوی؟ کتنی بدل گئی ہو گی؟ لیکن یہ چیزیں، جس دن سے اس نے گھر چھوڑا تھا۔ ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ جاتی تھیں اور اسی کے ساتھ لوٹ آتی تھیں۔

"پاپا، تم نے چائے نہیں انڈیلی۔" وہ کچن سے دو پلیٹیں لے کر آئی۔ ایک میں توس اور مکھن تھے اور دوسرے میں تلے ہوئے ساسیز۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"چائے انڈیلو نہیں تو بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ "ٹی وی کھول دوں۔ دیکھو گے؟"

"ابھی نہیں۔ سنو! تمھیں میرے اسٹیمپس مل گئے تھے؟"

"ہاں پاپا۔ تھینکس۔" اس نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم نے خط ایک بھی نہیں لکھا۔"

"ایک خط لکھا تھا۔ لیکن جب تمھارا تار آیا تو میں نے سوچا کہ اب تم آ ہی رہے ہو تو خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم سچ مچ کاکا ہو۔"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔ اپنے اس نام سے وہ چڑھتی تھی یہ نام اس نے برسوں پہلے اسے اس وقت دیا تھا جب وہ اسی کے ساتھ گھر میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور اس نے ہندوستان کا نام تک بھی نہ سنا تھا۔

بچی کی ہنسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھ آیا جیسے وہ کوئی بے چین پرندہ ہو جسے اپنے بچنے کی کوشش کے پُرفریب لمحے ہی میں پکڑا جا سکتا ہے۔ "ممی کب لوٹیں گی؟"

سوال اتنا اچانک تھا کہ لڑکی جھوٹ بول ہی نہ سکی۔ "وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اوپر، لیکن تم نے تو کہا تھا۔۔۔۔"

کرچ۔ کرچ۔ کرچ۔ وہ چاقو سے جلے ہوئے توس کو کھرچ رہی تھی جیسے اس عمل کے ساتھ ساتھ وہ اس کے سوال کو بھی کھرچ دینا چاہتی ہو۔ ہنس وہ اب بھی رہی تھی لیکن اب اس کی ہنسی برف میں جمے کیڑے کی طرح اس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔

"کیا انھیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟"

لڑکی نے توس پر مکھن لگایا پھر چائے اور پلیٹ اس کے آگے رکھ دی۔

"ہاں معلوم ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا وہ نیچے آ کر ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گی؟"

لڑکی دوسری پلیٹ میں ساسیز سجانے لگی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور مسٹرڈ اور کیچ اپ کی بوتلیں اُٹھا لائی۔

"میں اوپر جا کر پوچھ لیتا ہوں۔" اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ اس بات کے لیے اس کی بھی رضا چاہتا ہو۔ اور جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

"پلیز پاپا۔"

اس کے قدم رک گئے۔

"آپ پھر ان سے لڑنا چاہتے ہیں؟" لڑکی نے کچھ غصّے سے اسے دیکھا۔

"لڑائی؟" اس کے ہونٹوں پر ندامت آمیز ہنسی پھیل گئی "میں یہاں دو ہزار میل دور ان سے لڑنے آیا ہوں؟"

پھر آپ میرے پاس بیٹھیے۔ لڑکی کا گلا بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماں ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن باپ کے تئیں بے رحم نہیں تھی۔ وہ اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ "میں تمھارے پاس ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ توس، ساسیز اور ٹن کے اُبلے ہوئے مٹر کھانے لگا۔ لڑکی کی بھوک اڑ گئی تھی لیکن اس کی آنکھیں اسی پر ٹکی تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی توس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیتی۔ اور چائے پینے لگتی۔ اور پھر اس کی طرف دیکھتی اور چپ چاپ مسکرانے لگتی۔ گویا اسے دلاسا دے رہی ہو کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ تمھاری ذمہ داری مجھ پہ ہے اور جب تک میں ہوں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اسے ڈر نہیں تھا یہ یا تو گولی کا اثر رہا ہوگا یا سفر کی تکان۔ وہ کچھ دیر کے لیے لڑکی کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے کہا۔ لڑکی نے مشتبہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "کیا باتھ روم جائیں گے؟" لڑکی اس کے ساتھ ساتھ غسل خانے تک چلی آئی اور جب دروازہ اندر سے بند کر لیا تب بھی اسے محسوس ہوتا رہا کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہے

اس نے بیسن کا نل کھول کر سر اس کے نیچے کر دیا۔ پانی اس کے چہرے پر گرنے لگا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس کے کھلے سینے سے ادھورے لفظ باہر نکلنے لگے۔ جیسے کوئی اندر جمی ہوئی کائی کو اُلٹ رہا ہو۔ الٹی جو اندر سے سیدھی باہر آتی ہے۔ وہ گولی جو اس نے کچھ دیر پہلے کھائی تھی اب زرد چوہے کی سی بیسن کے سنگ مرمر پر تیر رہی تھی۔ پھر اس نے نل بند کر دیا اور رومال نکال کر منھ پونچھا۔ باتھ روم کی کھونٹی پر عورت کے میلے کپڑے ٹنگے تھے اور پلاسٹک کی ایک چوڑی بالٹی میں انڈرویئر اور بریزیر صابن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کھڑکی کھلی تھی اور باغ کا عقبی حصہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ کسی دوسرے باغ سے گھاس کٹنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی....

وہ جلدی سے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے کمرے میں چلا آیا۔ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ کچن میں آیا تو لڑکی نہیں دکھائی دی۔ ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو وہ بھی خالی پڑا تھا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ اوپر ولے کمرے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔ ایک عجیب سے خوف نے اُسے گھیر لیا۔ گھر جتنا پرسکون تھا اتنا ہی خطرے سے بھرا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کونے میں گیا جہاں اس کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ اور جلدی جلدی اسے کھولنے لگا۔ اس نے کانفرنس کے نوٹس اور کاغذ الگ کیے اور ان

کے نیچے سے وہ سارا سامان نکالنے لگا جو وہ دلّی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ لڑکی کے لیے ایمپوریم کا راجستھانی لہنگا۔ تانبے اور پیتل کے جھمکے جھالے جو اس نے جن پتھ پر تبتی لاما ہپّیوں سے خریدے تھے۔ لڑکی کی ماں کے لیے پشمینے کی کشمیری شال۔ ایک لال گجراتی زری دار سلیپر جسے لڑکی اور اس کی ماں دونوں پہن سکتے تھے۔ ہینڈ لوم کے پلنگ پوش، ہندوستانی ڈاک ٹکٹوں کا البم اور ایک بہت بڑی باتصویر کتاب "بنارس، دی ایٹرنل سٹی" فرش پر ایک چھوٹا موٹا ہندوستان جمع ہو گیا تھا جسے وہ ہر بار یورپ آتے وقت اپنے ساتھ سمیٹ لاتا تھا۔

اچانک اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ وہ کچھ دیر تک چیزوں کے ڈھیر کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے فرش پر بکھری ہوئی وہ لاوارث اور قابلِ رحم معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے دل میں ایک پاگل سی خواہش جاگی کہ وہ انھیں کمرے میں جوں کا توں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ کہاں چلا گیا؛ لڑکی تھوڑا بہت ضرور حیران ہو گی لیکن برسوں سے وہ اس سے اسی طرح اچانک ملتی رہی تھی اور بغیر کسی سبب کے بچھڑتی رہی تھی۔ وہ اس سے کہا کرتی تھی۔ "یو آر اے کمنگ مین اینڈ اے گوئنگ مین"، پہلے دکھ بھرے لہجے میں اور بعد میں ہنسی ہنسی میں..... اسے کمرے میں نہ بیٹھا دیکھ کر لڑکی کو زیادہ صدمہ نہیں پہنچے گا۔ وہ اوپر جائے گی اور ماں سے کچھ کہے گی۔ "اب تم نیچے آسکتی ہو، وہ جا چکے ہیں"۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ نیچے آئیں گے اور یہ دیکھ کر کہ اب ان دونوں کے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے، انھیں سکون ملے گا۔

"پاپا—!!"

وہ چونک پڑا۔ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ لڑکی کو دیکھا۔ جو کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی جادو کی پٹاری ہو جس نے اپنے پیٹ سے اچانک رنگ برنگی چیزوں کو اگل دیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے شرم تھی۔ جب بچّے اپنے بڑوں کو کوئی ایسا کرتب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جس کا بھید انھیں پہلے سے معلوم ہو تو وہ اس بات کو چھپانے کے لیے کہ اس کا بھید انھیں پہلے سے معلوم تھا، زیادہ بے چین ہو جاتے ہیں۔

"اتنی چیزیں؟" وہ آدمی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کیونکر لانے دیں؟ سنا ہے آج کل کسٹم

والے بہت تنگ کرتے ہیں۔"

"نہیں، اس بار انھوں نے کچھ نہیں کیا۔" آدمی نے پرجوش لہجے میں کہا۔ شاید اس لیے کہ میں سیدھا فرینک فرٹ سے آ رہا تھا۔" انھیں صرف ایک چیز پر شک ہوا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"کس چیز پر؟" لڑکی کے لہجے میں واقعی اضطراب تھا۔

اس نے اپنے بیگ سے دال بیجی کا ڈبہ نکالا۔ اور اسے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے دو چار دانے اٹھائے اور انھیں سونگھنے لگی۔ "کیا ہے یہ؟" اس نے متجسس نگاہوں سے آدمی کو دیکھا۔

وہ بھی اسی طرح سونگھ رہے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں اس میں چرس گانجہ تو نہیں ہے۔

"حشیش۔۔۔؟ کیا اس میں سچ مچ حشیش ملی ہے؟"

"کھا کر دیکھو۔"

لڑکی نے تھوڑی سی دال موٹھ منہ میں ڈالی اور فوراً ہی سی ... سی کرنے لگی۔

"مرچیں ہوں گی، تھوک دو۔" آدمی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

لیکن لڑکی نے اسے نگل لیا اور لال ہوتی ہوئی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگی۔

"تم بھی پاگل ہو۔۔۔۔ ساری نگل لی۔" آدمی نے جلدی سے پانی کا وہی گلاس اس کی طرف بڑھا دیا جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔

"مجھے پسند ہے۔" اور قمیص کی چڑھی ہوئی آستینوں سے منہ پونچھنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ "آئی لو اِٹ۔" وہ بہت سی باتیں آدمی کا دل رکھنے کے لیے کرتی تھی۔ انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ اور لڑکی اس کے قریب پہنچنے کے لیے وہ فاصلے بہت جلد طے کر لیتی تھی۔ جنھیں دوسرے بچے مہینوں میں طے کرتے ہیں۔

"کیا انھوں نے بھی اسے چکھ کر دیکھا تھا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں۔ ان میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ انھوں نے صرف میرا سوٹ کیس کھولا، کاغذوں کو الٹا پلٹا اور جب انھیں پتہ چلا کہ میں کانفرنس سے آ رہا ہوں تو انھوں نے کہا۔" مسٹر یو مے گو۔"

"کیا کہا انھوں نے؟" لڑکی ہنس رہی تھی۔

"انھوں نے کہا مسٹر لوٹس گو۔ لائک این انڈین کرو۔" آدمی نے آزادانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیا ہے یہ؟"

لڑکی ہنستی رہی۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی اور آدمی کے ساتھ پارک میں گھومنے جاتی تھی تو وہ ایک کھیل کھیلتے تھے۔ وہ پیڑ کی طرف دیکھ کر پوچھتا تھا۔ "او ڈیر۔ از دیر اینی تھنگ لوسی؟" اور لڑکی چاروں طرف دیکھ کر کہتی تھی۔ "یس ڈیر۔ دیر از اے کرو اوور دی ٹری۔" آدمی تعجب سے اس کی طرف دیکھتا۔ "کیا ہے یہ؟" اور وہ فاتحانہ انداز میں کہتی۔ "پوئم!"

"اے پوئم!" بڑھتی ہوئی عمر پر گزرے ہوئے بچپن کا سایہ لہرانے لگا۔ پارک کی ہوا، پیڑ، ہنسی۔ وہ باپ کی انگلی پکڑ کر اچانک ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جسے وہ برسوں پہلے چھوڑ چکی تھی اور جو کبھی کبھار رات کو سوتے وقت خوابوں میں دکھائی دے جاتی تھی۔

"میں تمھارے لیے کچھ انڈین سکّے لایا تھا۔ تم نے پچھلی بار کہا تھا نا!"

"دکھاؤ۔ کہاں ہیں؟" لڑکی نے کچھ زیادہ ہی للک کر پوچھا۔

آدمی نے سلمیٰ ستاروں کے کام والی ایک لال تھیلی اُٹھائی جسے ہپّی اپنا پاسپورٹ رکھنے کے لیے خریدتے تھے۔ لڑکی نے تھیلی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے ہوا میں جھلانے لگی۔ تھیلی کے اندر رکھی چونّیاں اور اٹھنّیاں کھنکنے لگیں۔ پھر اس نے تھیلی کا مُنہ کھولا اور سارے پیسوں کو میز پر اُلٹ دیا۔

ہندوستان میں سب لوگوں کے پاس ایسے ہی سکّے ہوتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "اور کیا سب کے لیے الگ الگ ڈھلیں گے!" اس نے کہا۔

"لیکن غریب لوگ؟" اس نے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک رات ٹی وی پر انھیں دیکھا تھا...." وہ سکوں کو بھول گئی۔ اور پس و پیش کے عالم میں فرش پر بکھری چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اس وقت پہلی بار آدمی کو محسوس ہوا کہ جو لڑکی اس کے سامنے بیٹھی ہے وہ کوئی اور ہے۔ پہچان کا فریم وہی ہے جو اس نے دو سال پہلے دیکھا تھا لیکن اس کی تصویر بدل گئی ہے۔ لیکن وہ بدلی نہیں تھی بس کہیں اور چلی گئی تھی۔ وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے۔ ان خفیہ منزلوں کے

بارے میں کچھ نہیں جانتے جو بچوں کے ساتھ عدم قربت کی بنیاد پر اوپر ہی اوپر بنتی رہتی ہیں۔ لڑکی اپنے بچپن کے تہہ خانے میں جاکر ہی اپنے باپ سے مل پائی تھی۔۔۔۔ لیکن کبھی کبھی اسے چھوڑ کر دوسرے کمروں میں چلی جاتی تھی جس کے بارے میں آدمی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"پاپا،" لڑکی نے اس کی طرف دیکھا "کیا میں ان چیزوں کو سمیٹ دوں؟"

"اتنی جلدی کیا ہے؟"

"نہیں، جلدی نہیں۔۔۔۔ لیکن ماں آکر دیکھیں گی تو۔۔۔۔!" وہ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ جیسے وہ ہوا میں کسی غیر مرئی خطرے کی بو سونگھ رہی ہو۔

"آئیں گی تو کیا؟" آدمی نے کچھ تعجب سے لڑکی کو دیکھا۔

"پاپا۔ آہستہ بولو۔۔۔۔!" لڑکی نے اوپر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا۔ گھر جیسے ایک جسم ہو جو دو حصوں میں بٹا ہوا ہو۔ جس کا ایک حصہ سن اور بے جان پڑا ہوا اور دوسرا حصہ وہ جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ تب اسے گمان ہوا کہ لڑکی کٹھ پتلی کا کوئی تماشہ کر رہی ہے وہ ڈور سے بندھی ہوئی ہے، جیسے جیسے وہ حرکت کرتی ہے ویسے ویسے وہ بھی جنبش کرتی ہے۔ لیکن وہ نہ ڈور کو دیکھ سکتا ہے اور نہ اسے جو اسے ہلا رہا ہے۔۔۔۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے خوف زدہ ہوکر اسے دیکھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"وہ نیچے نہیں آئیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"انھیں معلوم ہے آپ یہاں ہیں۔" لڑکی نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے وہ نہیں آنا چاہتیں؟"

"نہیں،" لڑکی نے کہا "وہ کسی وقت بھی آسکتی ہیں۔"

"کیسے پاگل ہیں۔ اتنی چھوٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ آپ بیٹھیے میں ابھی ان ساری چیزوں کو سمیٹ دیتی ہوں۔"

وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اور بڑی صفائی سے ہر چیز کو اٹھا کر کونے میں رکھنے لگی۔ مخمل کی جوتی، پشمینے کی شال، گجرات امپوریم کا بیڈ کور، اس کی پیٹھ اپنے باپ کی طرف تھی۔ لیکن اس کا باپ اس کے ہاتھ دیکھ سکتا تھا پتلے اور سانولے بالکل اپنی ماں کی طرح ویسے ہی

بے جان اور ٹھنڈے جو اس کی لائی ہوئی چیزوں کو دل سے قبول نہیں کرتے تھے بلکہ بے دلی سے اُنھیں ایک طرف کر دیتے تھے۔ وہ ایک ایسی بچّی کے ہاتھ تھے جس نے صرف ماں کی محدود اور محفوظ محبت کو چھونا سیکھا تھا۔ مرد کی بے قرار اور الم انگیز وارفتگی کو نہیں جو باپ کی جنس کی کالی گپھا سے امنڈتی ہوئی باہر آتی ہے۔

اچانک لڑکی کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ اُسے محسوس ہوا کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی پل فون کا خیال آیا جو زینے کے نیچے کوٹھڑ میں تھا اور زنجیر میں بندھے پلّے کی طرح زور زور سے چیخ رہا تھا۔ لڑکی نے چیزیں ویسی ہی چھوڑ دیں اور لپکتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئی۔ فون اُٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر وہ چلّائی "ماما، آپ کا فون!" بچّی ریسیور کو ہاتھ میں جھلاتی ہوئی زینے کی ریلنگ سے لگی کھڑی تھی۔ اوپر کا دروازہ کھلا اور زینہ ہلنے لگا۔ کوئی نیچے آ رہا تھا۔ پھر ایک سر لڑکی کے چہرے پر جھکا اور بندھے ہوئے جوڑے اور فون کے بیچ ایک پورا چہرہ اُبھر آیا...

"کس کا ہے؟" عورت نے لٹکتے ہوئے جوڑے کو پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔ اور لڑکی کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ آدمی کرسی سے اُٹھا..... لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ "ہیلو!" عورت نے کہا۔ "ہیلو۔ ہیلو۔" عورت کی آواز بلند ہوئی اور تب اسے پتہ چلا کہ یہ اس عورت کی آواز ہے جو اس کی بیوی تھی۔ وہ اسے برسوں بعد بھی سیکڑوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا..... اُونچے سُر کی خفیف سی کانپتی ہوئی، ہمیشہ کی سخت ضرر رساں پریشان۔ اس کے جسم کا واحد حصّہ جو بدن سے دور آدمی کی روح پر خون کی لکیر کھینچ دیتی تھی...... وہ جیسے اُٹھا تھا ویسے ہی بیٹھ گیا۔

لڑکی مسکرا رہی تھی۔

وہ دیوار پر لگے آئینے میں آدمی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ چہرہ کچھ ویسا ہی بے ہنگم دکھائی دے رہا تھا، جیسے عمر کے آئینے میں عورت کی آواز — اُلٹا، ٹیڑھا، ایک پہیلی کی طرح پُراسرار۔ وہ تینوں شخص از خود چار میں تقسیم ہو گئے تھے۔ لڑکی اور اس کی ماں۔ آدمی اور اس کی بیوی۔ گھر جب گرہستی میں بدلتا ہے تو اپنے آپ پھیلتا جاتا ہے.....

"تم جینی سے بات کرو گی؟" عورت نے لڑکی سے کہا اور لڑکی جیسے اسی لمحے کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ اچھل کر اوپری سیڑھی پر آئی اور ماں سے ٹیلی فون لے لیا۔ "ہیلو جینی۔ اٹ از می!" وہ

دو سیڑھیاں نیچے اتری۔ اب آدمی اسے پورا کا پورا دیکھ سکتا تھا۔

"بیٹھو....." آدمی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آواز میں ایک ملتجیانہ گزارش تھی۔ گویا اسے ڈر ہو کہ کہیں اسے دیکھ کر عورت اُلٹے پیروں لوٹ نہ جائے۔

وہ ایک لمحہ پس و پیش کے عالم میں رہی۔ اب واپس مڑنا فضول تھا۔ لیکن اس طرح اس کے سامنے کھڑے رہنے کا بھی کوئی تک نہیں تھا۔ وہ اسٹول کھینچ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔

"کب آئے؟" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ آدمی کو محسوس ہوا کہ ٹیلی فون پر کوئی دوسری عورت بول رہی ہے۔

کافی دیر ہو گئی..... مجھے۔ میں جانتا تھا کہ تم اوپر کمرے میں ہو۔" عورت چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

آدمی نے جیب سے رومال نکالا، پسینہ پونچھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔ میں بہت دیر تک باہر کھڑا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گھنٹی خراب ہے۔ گیراج خالی پڑا تھا۔ میں نے سوچا تم دونوں کہیں باہر گئے ہو.. تمھاری کار.....؟ اسے معلوم تھا پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔

"سروسنگ کے لیے گئی ہے!" عورت نے کہا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی اس طرح کی ہیچ اور فضول باتوں سے نفرت کرتی آئی تھی لیکن آدمی کے لیے یہ ایسے تنکے تھے جنھیں پکڑ کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی ڈوبنے سے بچا جا سکتا تھا۔

"تمھیں میرا تار مل گیا تھا؟" میں فرینک فرٹ آیا تھا اسی ٹکٹ پر یہاں آ گیا کچھ پونڈ زیادہ دینا پڑے۔ میں نے تمھیں وہاں سے فون بھی کیا تھا لیکن تم دونوں کہیں باہر تھے....."

"کب؟" عورت نے تھوڑے تجسس سے اسے دیکھا۔ "ہم دونوں گھر میں تھے۔"

"گھنٹی بج رہی تھی لیکن ریسیور کسی نے اُٹھایا نہیں۔ ممکن ہے کہ آپریٹر میری انگریزی نہ سمجھ سکی ہو اور غلط نمبر دے دیا ہو۔"

"لیکن سنو....." وہ ہنسنے لگا۔ "ایک عجیب بات ہوئی۔ ہیتھرو پر مجھے ایک عورت ملی جو پیچھے سے بالکل تمھاری جیسی لگ رہی تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے اسے پکارا نہیں..... ہندوستان کے باہر ہندوستانی عورتیں ایک ہی جیسی نظر آتی ہیں....." وہ بولے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ اس آدمی کی طرح تھا جو

آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہوا میں تنی ہوئی رسی پر چلتا ہے۔ عورت دور کہیں نشیب میں ایک خواب میں کھوئی ہوئی تھی اس عورت کو وہ بہت پہلے کبھی جانتا تھا لیکن اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے سامنے کیوں بیٹھا ہے؟

وہ چپ ہو گیا۔ اسے خیال ہوا کہ اتنی دیر سے وہ صرف اپنی ہی آواز سن رہا ہے۔ اس کے سامنے والی عورت بالکل خاموش بیٹھی ہے اور اس کی طرف بہت سرد اور بے کیف نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

”کیا بات ہے؟“ آدمی نے کچھ خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”میں نے تم سے منع کیا تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں!“

”کس کے لیے تم نے کس کے لیے منع کیا تھا؟“

”میں تم سے کچھ نہیں چاہتی ..... تم یہ سب چیزیں کیوں لاتے ہو۔ کیا فائدہ ان سے؟“

پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھا کہ کون سی چیزیں۔ پھر اس کی نگاہیں فرش پر گئیں ... شانتی نکیتن کا پرس، ڈاک ٹکٹوں کا البم، دال بیجی کا ڈبہ۔ وہ بالکل لٹی پٹی دکھائی دے رہی تھیں جس طرح وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اسی طرح وہ فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ ”کون سی بہت زیادہ ہیں؟ “اس نے کھسیاتے ہوئے کہا۔ انھیں نہ لاتا تو آدھا سوٹ کیس خالی پڑا رہتا۔“

لیکن میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔ تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے؟“ عورت کی کانپتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ اس آواز میں نہ جانے کتنے جھگڑوں کی اذیت کتنے دوزخوں کا پانی تھا جو باندھ کے ٹوٹتے ہی اس تک پہنچنے لگا۔ ایک ایک انچ آگے بڑھتا ہوا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور بھیگے ہوئے چہرے کو پونچھنے لگا۔

”کیا تمھیں اتنی دیر کا آنا بھی برا لگتا ہے؟“

”ہاں ....“ اس کا چہرہ تن گیا۔ پھر عجیب سی مایوسی میں وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی۔ بس!“

کیا یہ اتنا آسان ہے! وہ اس ضدی لڑکے کی طرح اسے دیکھنے لگا جو سوال سمجھ لینے کے بعد بھی ظاہر کرتا ہے کہ سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ”وکو! ...“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”پلیز!“

"مجھے معاف کرو..."، عورت نے کہا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"لیوی اَلوُن .... اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔"

"میں بچّی سے بھی ملنے نہیں آسکتا۔"

"اس گھر میں نہیں۔ کہیں باہر مل سکتے ہو۔"

"باہر!" آدمی نے ہڑبڑا کر سر اُٹھایا۔ "باہر کہاں؟"

اس پل میں وہ بھول گیا کہ باہر ساری دنیا پھیلی ہے۔ پارک، سڑکیں، ہوٹل کے کمرے۔ اس کی اپنی دنیا۔ بچّی کہاں کہاں اس کے ساتھ پھرے گی۔

لڑکی فون پر ہنس رہی تھی۔ کچھ کہہ رہی تھی۔ "نہیں، آج میں نہیں آسکتی۔ ڈیڈی گھر میں ہیں۔ ابھی ابھی آئے ہیں..." "نہیں مجھے معلوم نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں..." کیا نہیں معلوم؟ شاید اس کی سہیلی نے پوچھا تھا کہ اس کے ڈیڈی کتنے دن رہیں گے۔ سامنے بیٹھی عورت بھی شاید یہی جاننا چاہتی تھی۔ کتنی دیر۔ کتنی گھڑیاں۔ کتنی اذیت اسے ابھی اور اٹھانی پڑے گی؟

شام کی جاتی ہوئی دھوپ اندر آرہی تھی۔ ٹی وی کا اسکرین چمک رہا تھا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف عورت کی پرچھائیں تھی۔ جیسے خبریں شروع ہونے سے قبل اناؤنسر کی تصویر نظر آتی ہے۔ پہلے دھندلی اور غیر واضح پھر دھیرے دھیرے روشن ہوتی ہوئی... وہ سانس روکے ہوئے انتظار کر رہا تھا کہ وہ کچھ کہے گی گو کہ اسے معلوم تھا کہ سابقہ برسوں سے بس ایک ہی نیوز ریل ہے جو ہر بار ایک پرانی اذیت لے کر آتی ہے جس کا تعلق کسی دوسری زندگی سے ہے... اشیا اور انسان کتنے مختلف ہیں۔ برسوں بعد بھی گھر، کتابیں، کمرے ویسے ہی رہتے ہیں جیسا ہم چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن لوگ؟ وہ اسی دن سے مرنے لگتے ہیں جس دن سے الگ ہو جاتے ہیں۔ مرتے نہیں بلکہ ایک دوسری زندگی جینے لگتے ہیں۔ جو دھیرے دھیرے اس زندگی کا گلا گھونٹ دیتی ہے جو ہم نے ساتھ گزاری تھی...

"بچّی ہی سے نہیں..." اس کی آواز پھنسنے لگی... "میں تم سے بھی ملنے آیا تھا۔"

"مجھ سے؟" عورت کے چہرے پر ہنسی، حقارت اور حیرانی کے تاثرات ایک ساتھ ابھر آئے، "تمھاری جھوٹ کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔"

"تم سے جھوٹ بول کر اب مجھے کیا ملے گا؟"

"معلوم نہیں۔ مجھے جو ملا ہے میں اسے جھیل رہی ہوں۔ اس نے ایک ٹھہری ہوئی سرد نگاہ سے باہر کی طرف دیکھا۔" تمھارے بارے میں اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں کوئی اور راستہ اختیار کرتی۔

"کون سا راستہ؟" آدمی نے ایک ٹھنڈی سی جھرجھری لی۔

"کوئی بھی۔ میں تمھاری طرح اکیلی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اب اس عمر میں — اب تو کوئی مجھے دیکھتا بھی نہیں۔"

"وکو..... !" اس نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا نام مت لو..... سب ختم ہو چکا ہے۔"

" وہ رو رہی تھی۔ بالکل اکیلی سامنے والے شخص اور آئندہ کی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ آنسو جو کسی بوجھ کے ہٹ جانے سے نکل پڑتے ہیں۔ اس کی ڈھلوان زندگی پر تیز دھار کی طرح بہ رہے تھے۔ عورت بار بار انھیں پونچھ دیتی تھی۔

بچی کب سے فون کے پاس خاموش بیٹھی تھی۔ وہ سب سے نچلی سیڑھی پر تھی اور اپنی ویران آنکھوں سے روتی ہوئی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر نااُمیدی نہیں تھی۔ ہر خاندان کے کچھ تاریک پہلو ہوتے ہیں جو مسلسل ایک پہیے میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ اس پہیے میں ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ اتنی کم عمر میں وہ اتنے بڑے سچ کو جان گئی تھی کہ آدمی کے اندر اور باہر کے نظام میں ایک بے مثال تعلق ہے۔ وہ جب تک اپنا چکر پورا نہیں کر لیتے انھیں بیچ میں روک دینا جرم ہے۔

وہ آدمی کی طرف دیکھے بغیر ماں کے پاس آئی۔ کچھ کہا جس کا تعلق آدمی سے نہیں تھا۔ عورت نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بالکل اپنے پہلو سے لگا کر۔

صوفے پر بیٹھے وہ دونوں دو بہنوں کی طرح لگ رہے تھے۔ دونوں آدمی کو بھول گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے اُٹھنے والے طوفان میں گھر ڈوب گیا تھا لیکن اب پانی اترنے لگا تھا۔ اور اب آدمی وہاں تھا جہاں اُسے ہونا چاہیے تھا — کنارے پر اور لے — یہ معجزہ معلوم ہوا کہ وہ دونوں کے بیچ بیٹھا ہے لیکن دونوں کی نگاہوں سے اوجھل! وہ برسوں سے کوشش کر رہا تھا کہ وہ ماں

اور بیٹی کے بیچ غیر مرئی بن کر بیٹھا رہے۔ وہ جانتا تھا کہ غیر مرئی تو صرف خدا اپنی مہربانیوں میں ہوتا ہے۔ لیکن جو آدمی گڑھے کی تہہ میں ہوتا ہے اسے بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ماں اور بچّی نے توقع کے برخلاف اُسے تنہا چھوڑ دیا۔ اس کی طرف سے مُنہ موڑ کر انھوں نے اسے اپنے حال پر ٹھیک اس مقام پر چھوڑ دیا تھا جہاں برسوں پہلے اس نے گھر چھوڑا تھا۔

لڑکی ماں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”ہمارا باغ دیکھنے چلو گے؟“ اس نے کہا۔

”اسی وقت؟“ اس نے کسی قدر تعجب سے لڑکی کو دیکھا۔

وہ کچھ بے قرار اور مضطرب سی دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو جسے کمرے کے اندر کہنا ممکن نہ ہو۔

”چلو،“ آدمی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پہلے ان چیزوں کو اوپر لے جاؤ۔“

”ہم اُنھیں بعد میں لے جائیں گے۔“

”بعد میں کب؟“ آدمی نے اسے شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ چلیے تو!“ لڑکی نے اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا۔

”ان سے کہو اپنی چیزیں سوٹ کیس میں رکھ لیں۔“ عورت کی آواز بلند ہوئی۔

اسے محسوس ہوا کہ کسی نے ایک دم اسے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ ”کیوں؟“

”مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کے اندر ایک خوف ناک آندھی اُٹھنے لگی۔ میں نہیں لے جاؤں گا۔“ ”تم چاہو تو انھیں باہر پھینک دو۔“

”باہر —؟“ عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں ان کے ساتھ تمھیں بھی باہر پھینک سکتی ہوں۔“ رونے کے بعد اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور رخساروں پر اُبھرتے والی نمی شیشے کی طرح جم گئی تھی

”کیا ہم باغ دیکھنے نہیں چلیں گے؟“ بچّی نے اس کا ہاتھ کھینچا — اور وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

وہ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ گھاس کیاریاں اور درخت ایک خاموش فلم کی طرح اس کے سامنے چل رہے تھے۔ صرف اس کی بیوی کی آواز ایک بھیانک رواں تبصرے کی مانند گونج رہی تھی۔ — باہر... باہر...“

"آپ ممّی سے بحث کیوں کرتے ہیں؟" لڑکی نے کہا۔

"میں نے بحث کب کی؟" اس نے بچّی کو دیکھا۔ جیسے وہ بھی اس کی دشمن ہو۔

"آپ کرتے ہیں بحث۔" لڑکی کی آواز میں ضد تھی۔ وہ انگریزی میں 'یو' کہتی تھی جو اگر پیار سے کہا جائے تو تم کے معنی دیتا تھا اور اگر ناراض ہو کر کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا تھا آپ انگریزی کے ضمیر کی اس خصوصیت سے باپ بیٹی کا رشتہ ہوا میں معلق رہتا تھا۔ کبھی بہت اپنا اور کبھی بہت پرایا جس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اسے لڑکی کے لہجے کو تولنا پڑتا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے آدمی کو آگھیرا۔ وہ ایک ہی وقت میں ماں اور بچی دونوں کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔

"بڑا پیارا باغ ہے۔" اس نے لڑکی کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ "کیا مالی آتا ہے؟"

"نہیں مالی نہیں آتا ہے۔" لڑکی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میں خود شام کو پانی دیتی ہوں۔ اور چھٹی کے دن ممّی گھاس کاٹتی ہیں۔" "ادھر آؤ میں تمھیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لان بہت چھوٹا تھا۔ ہرا، پیلا، مخملیں۔ پیچھے گیراج تھا۔ اور دونوں طرف خاردار کانٹے بیچ میں ایک گھنا بوڑھا وِلو کھڑا تھا۔ لڑکی اس کے پیچھے اوجھل سی ہوگئی پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہو تم؟"

وہ خاموشی سے دبے پاؤں پیڑ کی پشت پر چلا آیا۔ وِلو اور خاردار تار کے بیچ کالی لکڑی کا ایک باڑا تھا۔ جس کے دروازے سے ایک خرگوش باہر جھانک رہا تھا۔ دوسرا خرگوش لڑکی کی گود میں تھا۔ وہ اسے یوں سہلا رہی تھی جیسے وہ اون کا گولا ہو جو کسی بھی وقت ہاتھ سے نکل کر جھاڑیوں میں گم ہو جائے گا۔

"یہ ہم نے حال ہی میں پالے ہیں.... پہلے دو تھے اب چار ہیں۔"

"باقی کہاں ہیں؟ باڑے کے اندر۔... ابھی بہت چھوٹے ہیں۔"

اس کا جی چاہا کہ خرگوش کو چھوئے۔ لیکن اس کا ہاتھ خود بخود اپنی بچّی کے سر پر پہنچ گیا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے چھوٹے بھورے بالوں سے کھیلنے لگا۔ لڑکی خاموش کھڑی رہی۔ خرگوش اپنی ناک سکوڑ سکوڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پاپا۔" لڑکی نے سر اٹھائے بغیر دھیرے سے کہا۔ "کیا آپ نے آج ہی کی واپسی کا Day return

ٹکٹ لیا ہے؟"

"نہیں۔ کیوں؟"

"یوں ہی۔ یہاں واپسی کا ٹکٹ بہت کم داموں میں مل جاتا ہے۔"

کیا لڑکی نے یہی پوچھنے کے لیے اسے یہاں بلایا تھا؟ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ لڑکی کے سر پر سے ہٹا لیا۔

"آپ رات کو کہاں رہیں گے؟" لڑکی نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"اگر میں یہاں رہوں تو؟"

لڑکی نے دھیرے سے خرگوش کو باڑے میں ڈال دیا۔ اور دروازہ کھٹ سے بند کر دیا۔

"میں مذاق کر رہا تھا۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آخری ٹرین سے لوٹ جاؤں گا۔"

لڑکی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہاں دو تین اچھے ہوٹل بھی ہیں...... میں ابھی فون کر کے پوچھ لیتی ہوں۔" بچی کا لہجہ بہت نرم تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ آدمی رات کو گھر میں نہیں رُکے گا وہ ماں کے پاس سے اُٹھ کر آدمی کے ساتھ ہولی۔ آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے اس طرح سہلانے لگی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے خرگوش کو سہلا رہی تھی۔ آدمی کا ہاتھ پسینے سے تر تھا۔

"سنو! میں آئندہ چھٹیوں میں انڈیا آؤں گی۔ اس بار طے ہے۔" اسے تعجب ہوا کہ آدمی اس بات پر بالکل خاموش رہا۔ اس وقت ڈربے میں صرف خرگوشوں کے پھدکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"پاپا...... تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

"تم ہر سال یہی کہتی ہو۔"

"کہتی ہوں۔ لیکن اس بار میں آؤں گی Don't you belive me اندر چلیں؟ ممی پریشان ہو رہی ہوں گی کہ ہم کہاں رہ گئے۔"

اگست کا اندھیرا چپ چاپ پھیل گیا تھا۔ ہوا میں ولو کی پتیاں سرسرا رہی تھیں۔ کمروں کے پردے گرا دیے گئے تھے لیکن باورچی خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ لڑکی بھاگتے ہوئے اندر گئی اور سنک (Sink) کا نل کھول کر ہاتھ دھونے لگی۔ آدمی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سنک پر لگے آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ جمی ہوئی گرد، بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں کے درمیان اس کا چہرہ اسے حیرت سے تک

رہا تھا۔ کوئی اُمید نہیں......

"پاپا۔ کیا تم اب بھی اپنے آپ سے باتیں کرتے ہو؟" لڑکی نے بھیگا ہوا چہرہ اوپر کیا۔ وہ آئینے میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ لیکن اب مجھے کوئی سنتا نہیں......" اس نے دھیرے سے بچّی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا فرج میں سوڈا ہوگا۔"

"تم اندر چلو۔ میں لاتی ہوں۔"

کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس کی چیزیں سمٹی جا چکی تھیں۔ سوٹ کیس کونے میں رکھا تھا۔ جب وہ دونوں باغ میں تھے تو شاید اس کی بیوی نے ان سب چیزوں کو دیکھا ہو، انھیں چھوا ہو۔ وہ اس سے چاہے کتنی ہی ناراض کیوں نہ ہو لیکن چیزوں کی بات الگ تھی۔ وہ انھیں اوپر تو نہیں لے گئی تھی لیکن انھیں سوٹ کیس میں رکھنے کی بھی ہمّت نہ کی تھی بلکہ انھیں ویسا ہی پڑا رہنے دیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب لڑکی سوڈا اور گلاس لے کر آئی تو اسے فوری طور پر پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن اتنی روشنی تھی کہ اندر بیٹھا آدمی چیزوں کے درمیان انھیں کا سا دکھائی دے۔ "پاپا..... تم نے بتی نہیں جلائی؟"

"جلاتا ہوں....." وہ اُٹھا اور سوئچ ڈھونڈنے لگا۔ بچّی نے سوڈا اور گلاس میز پر رکھ دیا اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔"

"ممّی کہاں ہیں؟"

"وہ نہا رہی ہیں۔ آتی ہوں گی۔"

اس نے اپنے بیگ سے وہسکی نکالی جو فرینک فرٹ کے ایئرپورٹ سے خریدی تھی۔ گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ "تمہاری جنجر ایل کہاں ہے؟"

"میں اب اصلی بیئر پیتی ہوں۔" لڑکی نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "تمھیں برف چاہیے؟"

"نہیں۔ لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟"

"باڑے میں راتب دینے ــــ ورنہ وہ ایک دوسرے کو مار کھائیں گے۔"

وہ باہر گئی تو کھلے دروازے سے باہر کا اندھیرا نظر آیا۔ تاروں کی زرد روشنی میں جھلملاتا

ہوا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ باہر کا سناٹا گھر کی غیر مرئی آوازوں سے چھن کر باہر آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہے۔ اور جو کبھی برسوں پہلے ہوا کرتا تھا، وہ اب ہو رہا ہے۔ وہ شاور کے نیچے گنگناتی رہتی تھی اور جب صافے کی طرح بالوں میں تولیہ لپیٹ کر وہ باہر نکلتی تھی تو پانی کی بوندیں باتھ روم سے لے کر اس کے کمرے تک ایک لکیر سی بناتی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں وہ لکیر بیچ میں کہاں سوکھ گئی؟ کون سے مقام پر اور کس خاص موڑ پر وہ چیز ہاتھ سے چھوٹ گئی جسے وہ کبھی دوبارہ نہیں پکڑ سکا۔

اس نے کچھ اور وہسکی انڈیلی حالانکہ گلاس ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اسے کچھ عجیب سا لگا کہ پچھلی رات بھی یہی گھڑی تھی جب وہ پی رہا تھا لیکن اس وقت وہ ہوا میں تھا جب ایئر ہوسٹس کی آواز سنائی دی کہ ہم چینل پار کر رہے ہیں تو اس نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ سمندر، نہ بجلی۔ بس اندھیرا اور اندھیرے میں بہتا اندھیرا، حد نگاہ تک۔ نیچے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ چینل جو نیچے کہیں نظر نہ آتا تھا اصل میں کہیں اندر ہے۔ اس کی ایک زندگی سے دوسری زندگی تک پھیلا ہوا جسے وہ ہمیشہ پار کرتا رہے گا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ نہ کہیں سے آتا ہوا نہ کسی طرف کو جاتا ہوا......

نقطہ کہاں ہے۔ اس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ لڑکی وہاں کتنی دیر سے کھڑی تھی اُسے پتہ ہی نہ چلا۔

عورت الگ کھڑی تھی بے نسٹر کے نیچے۔ نہانے کے بعد اس نے ایک میکسی پہن لی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور چہرہ دھلا اور چمکتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ میز پر رکھے اس کے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پرسکون تھا جیسے شاور نے نہ صرف اس کے گلاس کو بلکہ اس کی اذیت کو بھی دھو دیا ہو۔

"برف بھی رکھی ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں نے سوڈا لے لیا ہے۔ تمہارے لیے ایک بنا دوں؟"

اس نے سر ہلایا جس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا اسے معلوم تھا کہ گرم پانی سے نہانے کے بعد اسے کوئی ٹھنڈا مشروب اچھا لگتا تھا۔ عرصے بعد بھی وہ اس کی عادتیں نہیں بھولا تھا۔ بلکہ ان عادتوں کے سہارے ہی دونوں کے درمیان پرانی شناسائی لوٹ آئی تھی۔ وہ باورچی خانے میں

گیا اور اس کے لیے ایک گلاس لے آیا۔ اس میں تھوڑی سی برف ڈالی اور جب اس میں وہسکی ملانے لگا تو عورت کی آواز سنائی دی۔ "بس اتنی کافی ہے۔"

وہ شفاف آواز تھی جس میں کوئی رنگ نہیں تھا۔ نہ پیار کا نہ خفگی کا۔ ایک خاموش اور بے تاثر آواز۔ وہ سیڑھیوں سے ہٹ کر کرسی کے قریب چلی آئی تھی۔

"تم بیٹھو گی نہیں۔" اس نے کچھ افسردہ ہو کر پوچھا۔

اس نے اپنا گلاس اُٹھایا اور اسٹول پر وہیں بیٹھ گئی جہاں دوپہر کو بیٹھی تھی۔ ٹی وی کے قریب لیکن ٹیبل لیمپ سے دور ـــ جہاں سے صرف روشنی کی ایک باریک سی لکیر اس تک پہنچ رہی تھی۔

کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر عورت کی آواز سنائی دی۔ "گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ یہ سب چیزیں انھیں لوگوں نے بھیجی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" عورت نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیوں ان بیچاروں کو تکلیف دیتے ہو۔ تم ڈھو ڈھو کر یہاں لاتے ہو اور یہ یہاں بیکار پڑی رہتی ہیں۔"

"وہ بس چیزیں ہی بھیج سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "تم برسوں سے وہاں گئیں نہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں۔"

"اب جانے سے کوئی فائدہ ہے؟" اس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ "میرا اب ان سے کوئی رشتہ نہیں۔"

"تم بچی کے ساتھ تو آسکتی ہو۔ اس نے تو ابھی تک ہندوستان دیکھا بھی نہیں ہے۔"

عورت کچھ دیر چپ رہی ..... پھر دھیرے سے کہا۔ "اگلے سال وہ چودہ برس کی ہو جائے گی۔ اور تب قانون کے مطابق وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔"

"میں قانون کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ تمھارے بغیر وہ کہیں بھی نہیں جائے گی۔"

عورت نے گلاس میں سے آدمی کو دیکھا۔ "میرا بس چلے تو اسے وہاں کبھی نہ جانے دوں۔"

"کیوں؟" آدمی نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "کیا ہم دو ہندوستانی اس کے لیے کافی نہیں ہیں؟"

وہ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد کچن کا دروازہ کھلا لڑکی اندر آئی۔ چپ چاپ دونوں کو دیکھا اور زینے کی طرف جہاں ٹیلی فون رکھا تھا، بڑھ گئی۔

"کسے کر رہی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور فون کا ڈائل گھمانے لگی۔

آدمی اُٹھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "تھوڑا سا اور لوگی؟"

"نہیں....." اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آدمی دھیرے دھیرے وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلنے لگا۔

"کیا بہت پینے لگے ہو؟" عورت نے کہا۔

"نہیں،" آدمی نے سر ہلایا۔ "سفر میں کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔"

"میں نے سوچا تھا اب تک تم نے گھر بسا لیا ہوگا۔"

"کیسے؟ تمھیں یہ وہم کیسے ہوا؟"

عورت کچھ دیر تک سپاٹ آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ "کیوں اس لڑکی کا کیا ہوا؟ کیا وہ تمھارے ساتھ نہیں رہتی؟" اس کی آواز میں نہ جوش تھا نہ اذیت کا کوئی سایہ۔ جیسے دو آدمی زمانے بعد کسی ایسے واقعے پر تبادلۂ خیال کر رہے ہوں جس نے ایک ہی جھٹکے میں دونوں کو دو کناروں پر اچھال دیا ہو۔

"میں اکیلا رہتا ہوں۔ ماں کے ساتھ۔" اس نے کہا۔

عورت نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں..... میں شاید ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ اس کی آواز غیر معمولی طور پر دھیمی ہو گئی جیسے وہ اسے اپنی کسی خفیہ بیماری کے بارے میں بتا رہا ہو۔

"تم حیران ہو۔ لیکن ایسے لوگ ہوتے ہیں...."

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ محبت کے بارے میں، وفاداری کے بارے میں، یقین اور فریب کے بارے میں۔ ایک بڑا سچ جو بہت سے جھوٹوں سے مل کر بنتا ہے۔ وہسکی کے نشے میں بجلی کی طرح کوندتا ہے اور دوسرے ہی لمحے ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے.....

لڑکی شاید اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون چھوڑ کر آدمی کے پاس آئی۔ ایک بار ماں

کو دیکھا جو ٹیبل لیمپ کے پیچھے نیم تاریک گوشے میں چھپ گئی تھی۔ اور آدمی؛ وہ گلاس کی اوٹ میں صرف ایک دھبہ سا بن کر رہ گیا تھا۔

”پاپا،“ لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ تھا، ”اس پر ہوٹل کا نام لکھا ہے۔ ٹیکسی تمھیں صرف دس منٹ میں پہنچا دے گی۔“

اس نے لڑکی کو اپنے قریب کھینچ لیا۔ اور کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر تک تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے برسوں پہلے سفر پر نکلنے سے قبل گھر کے سب لوگ ایک ساتھ جمع ہو کر چپ ہو جایا کرتے تھے۔ آسمان پر بہت سے تارے نکل آئے تھے جن کی روشنی میں بوڑھا وِلو، جھاڑیاں اور خرگوشوں کا باڑہ ایک بے جان زرد اجالے میں پاس پاس سرک آئے تھے۔

اس نے اپنا گلاس میز پر رکھا، آہستہ سے لڑکی کو چوما، اپنا سوٹ کیس اُٹھایا اور جب لڑکی نے دروازہ کھولا تو وہ لمحہ بھر کے لیے دہلیز پر ٹھٹھک گیا۔ ”میں چلتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ پتہ نہیں یہ بات اس نے کس سے کہی تھی لیکن جہاں عورت بیٹھی تھی وہاں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہاں اتنی ہی گہری خاموشی تھی جتنی باہر اندھیرے میں جہاں وہ جا رہا تھا۔

کوے اور کالا پانی ہندی کے ممتاز و منفرد افسانہ نگار نرمل ورما (ولادت ۱۹۲۹ء۔ شملہ) کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۸۵ء) سے نوازا گیا تھا۔

اس افسانوی مجموعہ میں نرمل ورما کے سات افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ اگر ہندوستانی پس منظر کو اجاگر کرتے ہیں تو کچھ ہمیں یوروپی زمین اور زندگی سے متعارف کراتے ہیں تاہم انسانی جذبات اور رشتے کہیں تقسیم نہیں ہوتے۔ انسانی رشتوں میں جو ایک ٹھہراؤ اور سرد مہری ہے، جو اداسی اور بے چارگی ہے، وہ ان افسانوں کے ذریعے ہمیں گہرائی تک متاثر کرتی اور ان فنی اور تخلیقی تجربوں تک لے جاتی ہے جو کسی اکائی تک محدود نہیں۔ عہد حاضر کے نمائندہ یہ افسانے دیر تک اور دور تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔

اب تک نرمل ورما کے افسانوں اور فکر انگیز مضامین کے کئی مجموعے، چند ناول اور ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے تراجم ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ نرمل ورما کو ان کی ادبی خدمات پر مختلف اداروں سے اعزازات و انعامات بھی ملے ہیں جن میں مورتی دیوی پرسکار اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

'کوے اور کالا پانی' کا اردو ترجمہ ڈاکٹر انیس اشفاق نے کیا ہے جو خود ایک نوجوان افسانہ نگار، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

ISBN 81-260-0266-2
Price : Rs. 80/-